فہرست مطالب

اردو مقالات

بے مثل زبان و بیان ۔ اعجاز القرآن کا ایک نادر پہلو/ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری.....۷

مثنوی رمزالعباد کا ایک نادر اور نایاب مخطوطہ/ ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد.....۲۷

برصغیر میں فقہی ادب کی تسہیل وتفہیم ایک تاریخی وتحلیلی جائزہ / ڈاکٹر محمد عبداللہ ۴۷

عربی مقالہ

اللغة العربية فيى شبه القارة أثناء عصر الاستعمار الإنجليزى/الدكتورمقيت جاويد ۸۱

خصائص الإمام أبي جعفر محمد باقر (رضی اللہ عنہ) فيضوء "كشف المحجوب" ۱۲۹

مفتي محمد رمضان سيالوي

فارسی مقالہ

قصۂ سوھنی و مھینوال سرودۂ دونی چند رایزادہ/ڈاکٹر محمد ناصر،ڈاکٹر محمد صابر ۱۳۷

کشمیری مقالات

کشمیر.....اسلامی تاریخ کے تناظر میں (۱۳۲۰ء-۱۸۱۹ء) / ڈاکٹر خواجہ زاہد عزیز.....۱۴۹

انگریزی مقالہ

- **Intertext and Allusion in the Yunus' Story as Presented by the Holy Quran**

/ Muhammad Abid Nadeem, Prof. Dr. Hafiz Mahmood Akhtar 03

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 31, Sr.No.79, 2010, pp 07 - 26

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۱، اپریل۔جون ۲۰۱۰ء، شمارہ ۷۹

بے مثل زبان و بیان۔ اعجاز القرآن کا ایک نادر پہلو

ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری☆

Abstract:

Venus-like Arabic was born in the perfect state of beauty. It was developed in cosmopolitan city of Makkah al-Mukarramah and its surrounding where Arabian tribes from all over Arabian Peninsula used to gather for four months of peace. Because of interaction of various tribes and intermingling of various dialects of the Arabic language a new language took birth there which was termed as the Common Arabic Language by the modern linguists. This Common Arabic language, the language of orators and poets, was used as vehicle for the Quranic text. The miraculous part of the story is that the environment and the conditions provided for the growth of this language has never been provided for any other natural language of the world. It was done only in order to make it capable to encompass the divine meanings and pharases of the holy Qur'an. Unlike all other languages, Arabic has inherent capacity to fight all corrosive forces of time and to maintain itself as classical

and modern language at the same time. Finally, it can be said that the holy Quran has made the Arabic language an immortal and everlasting language.

یہ ایک ناقابل انکار اور شک و شبہ سے بالاتر حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم ایک لازوال الہامی کتاب ہے ۔ اس کا غیر معمولی اعتبار و عظمت، اس کی تازہ کاری ،دائمی وغیر مختتم

☆ وائس چانسلر، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا۔

حکمت،منفرد و بے مثل اُسلوب اور مسلسل و بے بہا معجز نمائی میں پنہاں ہے۔اقبالؒ نے قرآن کا تعارف پیش کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا:

آں کتاب ِزندہ قرآنِ حکیم
حکمت ِاو لایزال است وقدیم
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصر ہا پیچیدہ درآناتِ اوست
چوں بجاں دررفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود(۱)

'' قرآن کریم وہ زندہ و جاوید کتاب ہے ،جس کی حکمت ودانش قدیم بھی ہے اور دائمی و لازوال بھی ۔اس کی آیا ت کریمہ میں سینکڑوں نئ دنیاؤں کے بے نہایت امکانات پوشیدہ ہیں اوراس کے آنات ولمحات میں ان گنت صدیاں اور لا تعداد زمانے بند ہیں۔ جب یہ قلب و جاں میں اترتا ہے، تو انہیں زیر وزبر کر کے رکھ دیتا ہے۔جب یہ انقلاب آتا ہے،تو آدمی کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔''

انسان کے خالق نے اپنی عنایتِ بے پایاں سے بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی کی خاطر بعثتِ انبیا اور نزول کتب کا سلسلہ قائم فرمایا۔مختلف انبیا کو مختلف الہامی کُتُب اور صحف ِسماویہ عطا ہوئے۔ان کتب وصحف میں سے ،عمومی طور پر، ہم صرف چار کتابوں سے آگاہ ہیں۔ان چار کتابوں کے اسمائے مبارکہ، ان کی زمانی ترتیب کے اعتبار سے ،یوں ہیں: تورات، زبور، انجیل اور قرآن ۔مسند احمد بن حنبل کی ایک روایت میں آں جناب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانِ مبارک نقل ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے؛ جن میں سے تین سو پندرہ کو کتابیں دی گئیں۔(۲)اِس حدیثِ مبارکہ کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم خود بھی اس بات کی شہادت دیتا ہے:

وَ قَالُوْا لَوْ لَا یَاْتِیْنَا بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّہٖ اَوَلَمْ تَاْتِھِمْ بَیِّنَۃُ مَا فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی۔(۳)

''اور کہتے ہیں کہ یہ (پیغمبر) ہمارے پاس ،اپنے رب کی طرف سے ،کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے۔کیا ان کے پاس
پہلی کتابوں کی نشانی نہیں آئی؟''

اِسی طرح قرآنِ مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی .صُحُفِ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی۔(۴)

''یقیناً یہ بات پہلے صحیفوں میں (مرقوم) ہے۔ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔''

قرآن وحدیث کی یہ گواہیاں اس حقیقت کا اعتراف و اعلان ہیں کہ متذکرہ صدر چار معروف ومعلوم کتبِ سماویہ کے علاوہ بھی الہامی کُتُب وصحائف نازل ہوئے؛ تاہم یہ بات قطعی وحتمی ہے کہ ان ساری کتابوں میں آخری کتاب قرآنِ کریم ہے، جو نبی آخرالزمان علیہ الصلوۃ والسلام پرعربی زبان میں نازل ہوئی۔

عربی زبان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ زبان دراصل سامی زبانوں کے خاندان کی ایک نہایت محترم اور باوقارزبان ہے۔ زبانوں کی تشکیل و ترویج کا مطالعہ ایک نہایت اہم اور دلچسپ موضوع ہے۔ماہرین لسانیات نے زبانوں کو اپنی ساخت کے اعتبار سے مختلف خاندانوں میں بانٹ کر دیکھا ہے۔سامی زبانیں کون سی ہیں؟ اِس سوال کا جواب جاننے کے لیے جب ہم تاریخ سے رجوع کرتے ہیں، تو ہمیں یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے :سام، حام اور یافث۔حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی اولاد نے جو زبانیں اختیار کیں ، وہ سامی زبانیں کہلاتی ہیں اور اُن کے مذاہب سامی مذاہب۔ سامی مذاہب میں یہودیت ، عیسائیت اور اسلام شامل ہیں ۔ زبانیں تشکیل و ترویج ا ور تعدیم کے مراحل سے گزرتی رہتی ہیں۔سو متعدد سامی زبانوں میں سے ، بہت سی زبانوں کا وجود،گردش دوراں نے مٹا ڈالا۔ان زبانوں میں سے آج دو زبانیں مروّج ہیں۔ ایک عربی اور دوسری عبرانی ، جو اسرائیل میں بولی جاتی ہے۔قرآنِ کریم سامی زبانوں

کے خاندان کی ایک اہم زبان ،عربی میں نازل ہوا۔

قرآن کے لفظی معنی ہیں: ایسی کتاب، جو بہت زیادہ پڑھی جاتی ہو۔اِس کے معنی ایک ایسی کتاب کے بھی لیے جاتے ہیں، جو زبان پر چڑھ جاتی ہو۔(۵) یہی وجہ ہے کہ قرآن واحد ایسی کتاب ہے، جو لوگوں کو پوری کی پوری یاد ہو جاتی ہے ۔ اِس حقیقت میں کسی دوسری رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ واحد ایسی کتاب ہے، جس کے حفاظ دنیا میں سب سے زیادہ ہیں۔ جہاں تک باقی الہامی کتابوں کا تعلق ہے ، وہ اب دُنیا میں من وعن موجود ہی نہیں ہیں ، کیوں کہ اِن کے جو نسخے دست یاب ہیں ، وہ تحریف شدہ حالت میں ہیں۔قرآن کی عظمت کے حوالے سے یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ اِس وقت دنیا میں مذہبی تقدس کی حامل کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کا کوئی ایک بھی حافظ ڈھونڈے نہ ملے گا۔گرنتھ کا، بائبل کا،تورات کا ، ویدوں کا، اوِستا کا کوئی حافظ کسی نے کبھی دیکھا؟ لیکن یہ بات کتنی حیران کن ہے کہ قرآنِ کریم کے دس دس سال کی عمر کے حفاظ، آپ عالم اسلام کے کونے کونے میں دیکھ سکتے ہیں۔ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی مشہور کتاب " **الاتقان فی علوم القرآن** " میں لکھا ہے کہ قرآن کا حفظ کرنا مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔(۶) گویا مسلمانوں کی بستیوں میں کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور ہونا چاہیے، جو قرآن کریم کا حافظ ہو، اور اِسے مستقلاً یاد رکھے ۔

قرآنِ کریم کے اس اجمالی تعارف کے بعد ہمیں دراصل یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سے امتیازات اور خصوصیات ہیں، جو اسے دیگر الہامی اور سماوی کُتُب سے ممتاز کرتی ہیں۔قرآن، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، عربی زبان میں اُترا۔عربی زبان کی تاریخ جو ہم تک پہنچی ہے، وہ رسولِ کریم ﷺ کی ولادت باسعادت سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے تک کی ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ قرآن کے نزول سے قبل، زبان کی نشوونما اور ارتقا کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو اہتمام کیا، وہ بھی کسی اور الہامی کتاب کے حصے میں نہیں آیا۔(۷)

پیغمبر گرامی ﷺ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے ،وہیں پلے بڑھے، چالیس سال کی عمر میں باقاعدہ وحیِ الٰہی کا سلسلہ شروع ہوا۔ مکہ معظّمہ آنحضورؐ کی ولادتِ مبارکہ سے سو سال پہلے سے

ہی ایک بین الاقوامی شہر (Cosmopolitan City) کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔ اُس وقت تک جو دنیا موجود تھی، اُس کے کونے کونے سے ؛یعنی موجودہ افریقہ کی آخری حدوں ، یورپ کے شمال ، فلسطین کے علاقوں اور چین تک سے، گرمیوں اور سردیوں میں، تجارتی قافلے آیا کرتے اور مکہ مکرمہ میں قیام کیا کرتے۔محرم الحرام، شوال ، ذیقعد اور ذوالحجہ کے مہینوں میں، جن کو اسلامی تاریخ میں حرام ، یعنی بہت ہی حرمت والے مہینے قرار دیا گیا ہے ، جزیرۃ العرب ،خاص طور پر مکہ مکرمہ کے گردونواح میں ، ثقافتی میلے منعقد ہوتے ۔ان میلوں میں ایک بڑا میلہ ''سوقِ عکاظ'' کہلاتا ہے۔ سوق کے معنی عربی میں میلے کے ہیں۔''سوقِ عکاظ'' کے علاوہ چھوٹے بڑے کئی اور بھی انسانی اجتماع ہوتے ؛جس میں پورے جزیرۃ العرب کے لوگ شریک ہوتے ،بڑے بڑے خطیب اور زبان دان آتے ، جو اپنے خطبے سناتے، بڑے بڑے شعرا آتے، جو وہاں کی شعری مجالس میں اپنے قصیدے سناتے اور یوں اُن کے ذوق ،فکر وفن اور ذہنی اپج کو مقابلے کی میزان پر تولا جاتا۔ جو قصیدہ اول آتا ، اپنی شعری عظمت کے شرف کے طور پر خانہ کعبہ کے غلاف کے ساتھ لٹکا دیا جاتا۔ یہاں لٹکے ہوئے قصائد کو عربی ادبیات کی تاریخ میں معلقات کے نام سے جانا جاتا ہے۔یعنی کعبہ کے ساتھ لٹکے ہوئے مایۂ ناز قصیدے۔(۸)

عربوں کے مزاج کے حوالے سے یہ چیز حیران کن ہے کہ جوں ہی حرمت والے مہینوں میں سے کسی مہینے کا چاند نظر آتا،سونتی ہوئی تلواریں واپس اپنے نیاموں میں ڈال دی جاتیں ۔گویا چار مہینے عالمِ عرب میں امن کے ایسے مہینے تھے ،جن میں کوئی شخص تجارتی قافلوں پر حملہ کر سکتا تھا نہ کسی کی جان لے سکتا تھا۔ ایسی ایسی طویل جنگیں، جو عرب قبائل کے درمیان مسلسل چالیس چالیس سال تک لڑی گئیں، مثلاً حربِ بسوس وغیرہ میں بھی ، حرمت والے مہینوں کی حرمت کا اِس قدر لحاظ رکھا جاتا کہ اوزارِ حرب وضرب اتار کر سارے دشمن اکٹھے بیت اللہ کے اردگرد اپنا اپنا کاروبار کرنے لگتے ۔(۹)امن کے ان چار مہینوں میں، یونان ،مصر اور افریقہ وغیرہ دُور دراز علاقوں سے جو لوگ یہاں آئے ہوئے ہوتے، اپنا مال یہاں بیچتے اور حرام مہینوں کے اختتام سے قبل اپنے وطنِ مالوف کو واپس چلے جاتے۔ اِن چار مہینوں میں مختلف قوموں کے مختلف زبانیں بولنے والے لوگ مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہتے۔یوں مکہ مکرمہ

کی زبان پر ایک ایسا اثر مرتب ہوا کہ اُس میں یونانی ، لاطینی ، ہندی اور فارسی الفاظ شامل ہوتے چلے گئے ۔ گویا اُس وقت کی عربی بہت سے معرّب الفاظ(۱۰)اور جزیرۃ العرب کے مختلف عرب قبائل کے مختلف لہجوں کے محاسن کا خوبصورت مجموعہ بن چکی تھی۔ میں لسانیات کے ایک طالب علم کے طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ قرآنِ کریم کا متن اترنے سے پہلے، وہ زبان جس کو ہم ''اللغة العربية المشتركة ''یعنی''The Common Arabic Language '' کہتے ہیں،دراصل اُس وقت مکہ مکرمہ میں اشرافیہ،یعنی پڑھے لکھے لوگوں کی زبان تھی۔ یہی زبان سارے قبائل میں برابر پسند کی جانے والی اور شعراو خطبا کی زبان تھی۔(۱۱)

جامع اور الوہی تعلیمات پر مبنی کتاب کی زبان کو تائید ایزدی سے جو حالات میسّر آئے،وہ کسی اور زبان کے حصے میں نہیں آئے ۔اسی بات کو شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر جیرو سلاو سٹیٹکش (Jaroslav Stetkevych)نے اپنی کتاب :The Modern Arabic Literary Language میں اپنے انداز سے یوں بیان کرتا ہے:

"Venus -like, it was born in a perfect state of beauty, and it has preserved that beauty in spite of all the hazards of history and all the corrosive forces of time."(12)

''وینس (حسن و محبت کی دیوی) کی مانند عربی بھی وقتِ ولادت ہی سے حسن ورعنائی کے اوج کمال پر تھی۔اور اس زبان نے تاریخ کی جملہ دشواریوں اور وقت کی بے رحم اور موذی طاقتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے[آج تک] اپنے حسن و جمال کی حفاظت کی ہے۔''

لسانیات کی سمجھ بوجھ رکھنے والے جانتے ہیں کہ ہر چالیس پچاس میل کے بعد زبان کا لہجہ یا لوگوں کاVocal Cords' Behaviour کسی حد تک بدل جاتا ہے۔ ہمارے ہاں پنجابی اور اُردو زبانوں کے مختلف لہجوں میں بھی یہ حقیقت ملاحظہ کی جا سکتی ہے ۔ اُردُو میں لکھنؤ کا لہجہ اور ہے، دہلی کا اور۔ پنجابی میں بھی پنجاب کے مختلف علاقوں کے مختلف لہجے ہیں۔ سیالکوٹ ،گوجرانوالہ وغیرہ کا لہجہ اور ہے ،فیصل آباد، ساہیوال وغیرہ کا اور۔ سرائیکی میں بھی اَحمد پور لمے کا لہجہ اَور ہے، ڈیرہ غازی خان کا اَور۔مثلاً''اِدھر اُدھر'' کو ایک علاقے میں لوگ

''اَیدھر اُودھر'' کہتے ہیں، دوسرے میں ''ایتل اوتل'' اور تیسرے میں ''ایڈھے اوڈھے'' وغیرہ۔ سندھ کی حدود میں داخل ہوں تو اسی مفہوم کے لیے ''ہیڈھے ہوڈھے'' کے الفاظ سننے کو ملتے ہیں۔ لسانی تبدیلی و ترمیم کی یہی صورت عربوں میں بھی موجود تھی۔ ایک علاقے یا قبیلے میں ایک لفظ کو ایک انداز سے ادا کیا جاتا اور دوسرے علاقے یا قبیلے میں دوسرے انداز سے ۔ ایک لہجے کے لوگ ''ہ'' سہولت سے بولتے تھے ، جب کہ دوسرے لہجے کے لوگ اس آواز کو ''الف'' سے بدل دیتے تھے؛ بالکل اسی طرح جیسا کہ اوپر'' اِدھرادھر'' کے الفاظ کے حوالے سے پنجابی لہجوں کے اختلاف کا ذکر ہوا۔ اِسی لسانی حکمت کے پیشِ نظر قرآنِ کریم ''**اللغة العربية المشتركة** '' یعنی'' The Common Arabic Language ''میں اتارا گیا، جو سبھی لہجات کے محاسن کا مجموعہ تھی۔

اللغة العربية المشتركة کی ساخت ،مزاج اور اجزائے ترکیبی کو سمجھنے کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس کی جانب منسوب کتاب اللغات فی القرآن پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔عربی لسانیات میں لفظ ''لغات'' لہجات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔کتاب اللغات فی القرآن'' ابن حسنون کی روایت سے ہم تک پہنچی ہے۔اس کتاب کو چھ دہائیاں پیشتر عربی کے عظیم سکالر صلاح الدین المنجّد نے تدوین کے بعد شائع کیا۔اس مختصر کتاب میں سیدنا عبد اللہ بن عباس کتاب اللہ میں استعمال ہونے والے۲۶۵الفاظ کو موضوع بناتے ہیں اور ان کی رائے میں۲۶۵قرآنی الفاظ میں سے صرف ۱۰۴ قریشی الاصل ہیں اور باقی۱۶۱ الفاظ جزیرۃ العرب کے مختلف ۲۷ قبائل سے لیے گئے ہیں۔(۱۳)

اس ضمن میں یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔امام العجلونی نے کشف الخفاء میں بیان کیا ہے کہ آنحضورؐ کی خدمت میں قبیلہ بنوسُلیم کا ایک وفد حاضر ہوا(قبیلہ بنوسلیم کی زبان قریشی لہجے سے خاصی مختلف تھی)۔آپؐ کے پاس حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی تشریف فرما تھے۔ بنوسلیم کے لوگ آپؐ سے بات کرتے رہے اور آپ ان کے سوالات کے جوابات بھی دیتے رہے ۔اس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ آپؐ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں:

ما قال لک وما قلتَ له لم نفهم هذا.
''بنوسلیم کے نمائندے نے آپ سے جو کچھ کہااور جو کچھ آپ نے اس سے فرمایا،ہمیں کچھ سمجھ نہیں آیا۔''

پھر کہا:

مارأیتُ افصح منک یا رسول الله فمن ادَّبک ۔
''یارسول اللہ! میں نے آپؐ سے زیادہ فصیح کوئی نہیں دیکھا۔آپؐ کو یہ لہجات کس نے سکھائے ہیں۔''

آپؐ نے فرمایا:

ادَّبنی اللّٰه فاحسنَ تادیبی و نشئتُ فی بنی سعد.
''مجھے یہ (لہجے اور زبانیں بولنا)اللہ نے سکھایا ہے ۔اور مین بنی سعد میں پلا بڑھا ہوں۔''(۱۴)

جزیرۃ العرب کے سبھی لہجات کے محاسن کا مجموعہ قرآن کریم کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

جزیرۃ العرب کی یہی اللغة العربية لمشتركة (مشترک عربی زبان) وہاں کی اشرافیہ، ادبا اورشعرا کی زبان تھی۔ اسی پاکیزہ اور منجھی ہوئی زبان میں قرآن کریم نازل کیا گیا۔ اگر کوئی اس زبان کے مقاییس اور منضبط کردہ اصولوں کے خلاف پیرایہ اظہار اختیار کرتا تو اس کا محاسبہ کیا جاتا۔ ابو الطيب الغوی، مراتب النحويين میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے آپ ﷺ کی مجلس میں [قرآنی اسالیب کے برعکس] غلط انداز میں اپنا موقف بیان کیا، تو آپ ﷺ نے دیگر صحابہ سے فرمایا: ''ارشدوا اخاکم.....'' ''اپنے بھائی (جوکج روہو گیا ہے) کی راہنمائی کرو'' (۱۵) سیدنا عمر بن الخطاب اور سیدنا عمر بن عبدالعزیز کے ایسے بیسیوں واقعات ہیں جن میں آپ حضرات نے گورنروں کوخطوط یا وفود میں آنے والے لوگوں کی زبان کی اغلاط پر نشاندہی کی اور انہیں قرآنی استعمالات کی مطابقت میں لفظوں کے استعمال اور پیرایہ

اظہار اختیار کرنے کی تاکید فرمائی۔(۱۶) تاریخ ادب عربی کی اکثر کتب میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی کو قرآن کریم کے کسی لفظ یا ترکیب کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی تو سیّدنا عمرؓ اسے مشورہ دیتے: فَتِّشُوْہ فی اشعار العرب'' اس چیز کو عربوں کی شاعری میں تلاش کرو تاکہ تم قرآن کریم کے پیرائے کو درست طور پر سمجھ سکو۔ امام شاطبی نے الموافقات میں نقل کیا ہے: ''قال عمرؓ: ایھا الناس تمسکوا بدیوان شعرکم فی جاھلیتکم فانّ فیه تفسیر کتابکم'' اے لوگو! عربوں کی زمانہ قبل از اسلام کی شاعری کے ریکارڈ کو پیش نظر رکھو کیونکہ اسی سے تم اپنی کتاب (قرآن کریم) کو [ڈھنگ سے] سمجھ پاؤ گے۔(۱۷)

یہی بات سیّدنا عبداللہ بن عباسؓ نے فرمائی: ''الشعردیوان العرب فاذا خفی علینا الحرف من القرآن الذی انزله الله بلغة العربی رجعنا الی دیوانها فالتمسنا ذلک'' یعنی شاعری ہی عربوں کی زندگی کا ریکارڈ اور دیوان ہے۔ جب ہمیں قرآن کا کوئی لفظ جو اللہ نے عربی زبان میں نازل کیا ہے سمجھ نہیں آتا تو ہم عربی شاعری کی جانب رجوع کرتے ہیں اور ہمیں وہاں سے اس کا صحیح مفہوم مل جاتا ہے۔(۱۸)

عربوں کا ایک امتیازی وصف یہ بھی تھا کہ وہ زبان کے عاشق تھے۔ کسی اچھی گفتگو کرنے والے اور زبان کی باریکیوں اور نفاستوں سے آگاہ شخص کو عرب معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور اِس خوبی کی بنیاد پر اُس کی بہت پذیرائی ہوتی۔ جس قبیلے میں کوئی شاعر پیدا ہوجاتا ، اُس میں جشن منایا جاتا۔ اللہ کا ایک نظام اور قانونِ قدرت، جو فی الواقع انسانی نفسیات کی بڑی گہری بصیرت سے عبارت ہے ، یہ رہا ہے کہ جس نبی کو جو معجزہ عطا ہوا، وہ اس کی قوم اور معاشرے کے مزاج ، ماحول ،نفسیات، دلچسپیوں اور مرکزِ نگاہ بننے والی چیزوں کی رعایت سے عطا ہوا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں جادو کا زور تھا۔ سو حضرت موسیٰؑ کو عصا اور یدِ بیضا کی شکل میں وہ معجزہ عطا ہوا کہ جادوگر عاجز آ گئے ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں طب کا بہت چرچا تھا۔ ایسے بڑے بڑے اور فاضل اَطِبّا تھے کہ دُور ہی سے ایک آدمی کے چہرے مہرے اور چال کو دیکھ کر اُس کی بیماری کی تشخیص کر دیتے تھے؛ سو جناب مسیح

علیہ السلام کو ایسا معجزہ دیا گیا کہ بیماروں کی تشخیص وعلاج تو کجا آپ مردے کو زندہ کر دیتے۔آنجناب علیہ السلام "قُم باذن اللّٰہ "یعنی :اللہ کے حکم سے کھڑے ہو جاؤ، کہتے اور مردہ زندہ ہو جاتا؛پیدائشی اندھوں کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرکر انہیں بینا کر دیتے ؛ لوگوں کو بتا دیا کرتے کہ انہوں نے کیا کھایا اور کیا بچا کر رکھا ہے ۔حضورؐ کو عربوں کی زبان آوری کی رعایت سے قرآن کی صورت میں ایسا معجزانہ کلام عطا ہوا کہ اسے سن کر بڑے بڑے زبان دان اور شعرا وخطبا دنگ رہ گئے ،اور اُنہیں تسلیم کرنا پڑا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ؛ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، بڑے بڑے شعرا کے قصیدے اوّلیت کا شرف پاکر خانۂ کعبہ کے ساتھ آویزاں ہونے کے مستحق قرار پاتے تھے ؛ جب آپؐ پر سورۃ الکوثر اُتری :

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَر. فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ . اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ.(۱۹)

"بے شک ہم نے آپ کو کوثر عنایت فرمائی ہے،۔پس اپنے رب کی نماز پڑھو اور قربانی کرو۔بلا شبہ تمہارا دشمن ہی بے نام و نشان رہے گا۔"

تو حضورؐ نے اِس سورہ مبارکہ کو لکھوا کر کعبہ کے ساتھ آویزاں کر دیا۔کسی عرب شاعر نے یا بہت بڑے عربی دان نے، ایک چوتھی لائن کا اضافہ بایں الفاظ کیا:

اِنَّ ھٰذَا لَیسَ بِکَلامِ البَشَر ۔

"یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے"۔(۲۰)

یہ پذیرائی ،قرآنِ عظیم کا یقینی حق تھا۔قرآن کی صداقت اور فصاحت و بلاغت کے حوالے سے تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ابوجہل، ابوسفیان، عتبہ، شیبہ اور قرآن کے بڑے بڑے دشمن بھی، راتوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے ہوئے، چپکے چپکے آ کے سنتے اور ایسی فصیح و بلیغ زبان پر سر دھنا کرتے۔(۲۱) اُن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ ہرگز کسی انسان کا کلام نہیں، لیکن یہ محض اُن کی ہٹ دھرمی تھی کہ زبان سے اِس حقیقت کا اقرار نہ کرتے تھے ۔ ایمان اور تسلیم کی خُو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ توفیق الٰہی ہی سے ارزانی ہوتی ہے۔ ان

لوگوں کو یہ توفیق نصیب نہ ہوئی۔قرآن لوگوں کو کس زبردست انداز سے متاثر کرتا تھا؟ اس حوالے سے مسلم ادبیات کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔حبشہ کا عیسائی بادشاہ اصحمہ نجاشی حضرت جعفر طیارؓ سے سورہ مریم کی چند آیات سن کر اشکبار ہوگیا تھا۔حضرت عمر فاروقؓ جو حضورؐ کو شہید کرنے کے ارادے سے نکلے تھے، قرآن کریم کی چند آیات سن کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے ۔ عتبہ بن ربیعہ کفار کی طرف سے دنیاوی لالچ پیش کرنے کی غرض سے حضورؐ کے پاس پہنچا۔حضورؐ نے سورۂ حم السجدہ کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ وہ اس قدر متاثر ہوا کہ واپس آ کر کفار سے کہنے لگا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔تم لوگ قرآن کو جادو اور شاعری کہتے ہو۔ میں جادو اور شاعری کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ خدا کی قسم! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کلام پیش کر رہے ہیں ،اس جیسا کلام میں نے آج تک نہیں سنا۔ یہ جادو و شاعری سے بالکل مختلف چیز ہے۔اقبالؒ نے کیا خوب کہا تھا:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است(۲۲)

’’میرے دل میں جو راز پوشیدہ ہے ،فاش کیے دیتا ہوں۔ جان لو :یہ
قرآن محض کتاب نہیں کوئی بڑی ہی منفرد و بے نظیر چیز ہے۔‘‘

حضورؐ کے وصال کے فوراً بعد مرتدین کا فتنہ اٹھا ۔بہت سارے لوگ اسلام سے پھر گئے ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لازوال پذیرائی کو دیکھ کر کئی لوگ نبوت کے دعوے دار بن بیٹھے۔ اُن میں جو کوئی زبان دان تھے، اُنھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ جبرائیل علیہ السلام ہمارے پاس آتے اور وحی لاتے ہیں ۔جھوٹے مدعیان نبوت میں سے ایک شخص مسیلمہ کذّاب تھا۔یہ شخص قرآنِ کریم اورآں جنابؐ کا بہت بڑا دشمن تھا۔اس نے ،حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں ، دعویٰ کیا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اِس دعویٰ کذب و افترا پر حضرت خالد بن ولیدؓ نے اُسے ،’’حدیقۃ الرحمٰن‘‘ میں، جو موجودہ ریاض کے قریب ایک علاقہ ہے،

واصل جہنم کیا۔(۲۳)اِس قسم کے دعووں کے زیرِ اثر، جھوٹی آیات و وحی کے جو متعدد نمونے سامنے آئے، یہاں ان میں سے ایک کا ذکر کیا جاتا ہے، کسی جویائے علم و تحقیق نے مزید نمونے ملاحظہ کرنا ہوں، تو وہ ابن کثیر کی کتاب 'البداية والنهاية' کے مطالعہ سے فیض یاب ہوسکتا ہے۔(۲۴) مسیلمہ کذاب نے سورة القارعة سن رکھی تھی:

اَلْقَارِعَةُ. مَا الْقَارِعَةُ . وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَةُ . يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ. وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ . فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ . فَهُوَ فِیْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ . وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ . فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ . وَمَآ اَدْرٰکَ مَاهِيَهْ .نَارٌ حَامِيَةٌ .(۲۵)

''کھڑ کھڑانے والی ۔کھڑکھڑانے والی کیا ہے؟اورتمہیں کیا معلوم کہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے؟(وہ قیامت ہے)جس دن لوگ یوں ہوں گے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے۔اور پہاڑ یوں ہو گے جیسے رنگ برنگ کی دھنکی ہوئی اون۔تو جس کے (اعمال کے)وزن بھاری ہوں گے ،وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔اور جس کے وزن ہلکے نکلے،اس کا مرجع ہاویہ ہے،اور تمہیں کیا معلوم کہ ہاویہ کیا ہے؟ آگ ہے بھڑکتی ہوئی۔''

اِس سورۂ مبارکہ میں قیامت کے وقوع پذیر ہونے کا ذکر ہے ،اور انسانوں پر واضح کیا گیا ہے کہ یہاں اُن کا قیام مستقل نہیں ہے اورعنقریب وہ دِن ظاہر ہونے والا ہے، جب انسان پتنگوں کے مانند اڑتا پھرے گا، اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوا کے دوش پر سوار ہوں گے۔مسیلمہ کذّاب سے جب لوگوں نے استفسار کیا کہ اُس پر کیا وحی نازل ہوئی ہے؟ تو اُس نے نے کچھ عبارات گھڑکر اپنی وحی کے طور پر پیش کیں ۔(۲۶) سورةالقارعة کے آہنگ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُس نے جو الفاظ گھڑے، وہ کچھ یوں ہیں:

''الفيلُ .ما الفيل . وما ادراک ماالفيل . لهُ خرطومٌ طويلٌ ولهٗ ذنب قصير.''(۲۷)

''ہاتھی، تمھیں کیا معلوم کہ ہاتھی کیا ہوتا ہے؟ تم کیا جانو کہ ہاتھی کیا ہے؟ اُس کی لمبی سونڈ اور چھوٹی سی دُم ہوتی ہے۔''

یہ بالکل ایسے ہی ہے، جیسے بچے ٹوٹ بٹوٹ کی کہانیاں سنتے ہیں۔کہاں یہ فضول و لا یعنی تک بندی اور کہاں قرآن !ایک معمولی سا صاحبِ فہم بھی اس عبارت کو قرآن کے مقابل دیکھ کر اِس کی ہنسی اڑائے بغیر نہیں رہ سکتا۔قرآن نے اپنے بےنظیر کلام ہونے کا دعوی کرتے ہوئے چیلنج کیا تھا:

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ص وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ.(۲۸)

''اوراگر تمہیں اس (کلام) میں ،جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ، کچھ شک ہے تو اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ۔

اور(اس کام کے لیے)اللہ کے علاوہ، اپنے حمایتیوں اورمدد گاروں کوبھی بلا لو،اگر تم سچے ہو۔''

لیکن قرآن کی صداقت کا یہ منہ بولتا ثبوت ہے کہ گزشتہ ساڑھے چودہ سو برس میں ایک بھی ایسی تحریر پیش نہیں کی جا سکی ، جوفکری وفنی محاسن کے اعتبار سے کسی بھی طرح قرآن کے برابر کہی جا سکے۔ یہاں قرآن کے معارضہ کی جدید کوششوں اور ان کی ناکامی کی دو مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

۱۹۷۲ء میں مصر میں دارالمعارف نے الانجیل للقدیس متیؒ کے نام سے انجیل متّی (Gospel of Mathew) کا عربی ترجمہ شائع کیا۔ یہ ترجمہ پروفیسر زکی شنودہ،ڈاکٹر مراد کامل،ڈاکٹر باھور لبیب اور پروفیسر حلمی مرادایسے بڑے بڑے مسیحی عرب ادیبوں (۲۹) پر مشتمل ایڈیٹوریل بورڈ نے تیار کیا۔ اس ترجمہ کے لیے قرآنی ذخیرہ الفاظ کا سہارا لیا گیا۔ اور پورے ترجمہ میں ساری عبارتیں قرآنی اسلوب کی نقالی کرنے کے ساتھ ساتھ قرآنی الفاظ سے

ترتیب دی گئیں۔ اور یوں گویا انجیل متیؔ کو قرآن کے مقابل لانے کی کوشش کی گئی۔لیکن بایں ہمہ قرآن اورالانجیل للقدیس متیؔ میں بعد المشر قین صاف ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ۔چند مثالیں دیکھیے :

قرآن کریم میں ہے:

اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُکِیًّا .(۳۰)

انجیل مقدس میں نقل کیا گیا ہے:

وحین اتوا الی البیت رأوا الصبیَّ مع مریم،فخرّوا وسجدوا له.(۳۱)

درج ذیل آیت میں قرآنی اسلوب ملاحظہ ہو:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ.(۳۲)

انجیل مقدس میں قرآنی انداز اپنانے کی کوشش یوں کی گئی:

وضرب لهم مثلاً آخر.(۳۳)

سورہ لقمان کی حسب ذیل آیت میں اسلوب قرآنی ملاحظہ ہو:

اِنَّهَآ اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَکُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ .(۳۴)

انجیل مقدس میں حبّۃ خردل کی ترکیب ملاحظہ فرمائیں:

یشبه ملکوت السماوات والارض حبّة خردل.(۳۵)

علامہ طنطاوی جوہری ،جو ۲۱۔۱۹۲۰ء کے لگ بھگ فوت ہو گئے تھے ،'جواہر القرآن' میں لکھتے ہیں کہ فرانس میں مستشرقین کی بہت بڑی کانفرنس ہوئی ، جس میں اُنھوں نے کہا کہ آپ کے پاس قرآن کے Un-immitable ہونے کی کیا دلیل ہے۔علامہ جوہری نے

مستشرقین کو جواب دیا کہ مجھے اِس تصوُّر کو عربی میں ڈھال دیجیے کہ جہنم بہت وسیع ہے، یہ کبھی نہیں بھرے گی ،تو سارے مستشرق جو عربی زبان کے جید علما تھے، اُنھوں نے اپنے اپنے طور پر اس تصوُّر کو عربی میں بیان کیا کہ : "**لن تملا ء جهنم**"جہنم کبھی نہیں بھرے گی؛ "**اِن الجهنم واسعة**" جہنم بہت وسیع ہے؛ "**اِ ن الجهنم لواسعة**" یقیناً جہنم بہت وسیع ہے۔"**ان الجهنم كبيرة جداً**" یقیناً جہنم بہت بڑی ہے۔دس پندرہ پیرایوں میں انھوں نے اِس خیال کو عربی میں بیان کیا، تو علامہ طنطاوی جوہری ، مستشرقین سے گویا ہوئے کہ اب میں تمھیں بتاتا ہوں کہ قرآنِ کریم نے اس تصوُّر کو کس طرح بیان کیا ہے۔قرآن کہتا ہے:

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ .(۳۶)

''جس دن ہم جہنم سے کہیں گے: کیا تو بھر گئی؟اور وہ گویا ہوگی: کیا کچھ اور بھی ہے؟''

کوئی مستشرق وُسعت کے اِس تصوُّر تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اُنھوں نے اِس بات کو تسلیم کیا کہ اس کتاب سے زیادہ بلیغ کوئی کتاب دنیا میں نہیں ہے۔(۳۷)

یہاں ایک پہلو اور غور طلب ہے کہ دنیا کی ساری پُرانی زبانیں رفتہ رفتہ زمانے کی دستبرد کا شکا رہوتی گئیں۔ مثلاً؛ برصغیر کے قدیم زمانے میں ہند میں سنسکرت کا طوطی بولتا تھا؛ لاطینی زبان پورے سنیٹرل یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی؛ اِسی طرح کسی زمانے میں یونانی زبان کا بڑا چرچا تھا۔یہ ساری زبانیں اپنی موت آپ مر گئیں ،اور اِن کا رواج متروک ہوگیا؛ مگر عربی زبان اپنے تمام تر شکوہ اور توانائی کے ساتھ قائم و دائم ہے ۔ دیگر زبانوں کے معدوم ہوجانے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان ساری زبانوں کو دراصل قرآن جیسی کسی کتاب کی سرپرستی حاصل نہ ہوئی۔قرآن کے اعجاز کا ایک بہت بڑا پہلو یہ بھی ہے کہ اِس کے وسیلے سے عربی زبان آج تک اُسی طرح تروتازہ ہے، جیسے آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے تھی ۔زبانوں کی تبدیلی کا احوال ملاحظہ کریں تو قرآن کے اعجاز کا یہ پہلو روز روشن کی طرح عیاں

ہو جاتا ہے۔عربی کے علاوہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جو ساڑھے چودہ سو سال تو درکنار ،صرف تین چار سو سال تک بعینہ اپنی حالت پر قائم رہ سکی ہو۔آج کی سب سے ترقی یافتہ اور بین الاقومی زبان انگریزی ہی کو دیکھ لیجیے۔انگریزی کا مشہور شاعر چوسر،جس کی نظمیں کالاسیکل لٹریچر کے ضمن میں، ہمارے ہاں ایم ۔اے انگریزی وغیرہ کے نصاب میں بھی شامل ہیں،کی انگریزی آج کی انگریزی سے یکسر مختلف ہے ۔یہاں تک کہ آج کا کوئی بھی انگریزی دان،جس کو چوسر کی شاعری کا علم نہ ہو، یا اس نے کسی ماہر استاد سے اسے پڑھا نہ ہو،نہ صرف یہ کہ سمجھ نہ سکے گا ، بلکہ اسے کسی طرح انگریزی شاعری ہی قرار نہ دے گا۔اردو کو دیکھیں تو ولی دکنی کے زمانے کی اردو اور آج کی اردو میں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔وعلی ھذا القیاس،آج دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جو صرف چار پانچ سو سال سے بعینہ موجود ہو۔اس کے برعکس عربی زبان آج بھی وہی ہے ،جو نزول قرآن کے زمانے میں تھی ۔عربی زبان کے اس حیرت انگیز بقا و دوام کا راز قرآن کریم ہے ۔یہ عربی مقولہ اپنی جگہ انتہائی اہم ہے :

"لو لاالقرآن لما کانت العربیة"

''اگر قرآن نہ ہوتا تو عربی زبان بھی باقی نہ رہتی۔''

آج کے دور میں چھوٹی بڑی بائیس عرب ریاستیں ہیں؛ ان ساری عرب ریاستوں کی دفتری زبان عربی ہے اور یہ عربی بھی وہ ہے، جو قرآنِ کریم سے ماخوذ ہے۔عربی زبان کے تمام تر قواعد قرآنِ کریم سے لیے گئے ہیں۔قرآن کریم عربی زبان کی سب سے پہلی اور سب سے بلیغ کتاب ہے اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ اگر قرآن نہ ہوتا تو عربی زبان بھی موجودہ صورت میں آج باقی نہ ہوتی۔ یہ امر بذاتِ خود قرآن کے مسلسل معجزہ ہونے کی واضح دلیل ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ قرآنِ کریم کو بہت آسان بنایا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے :

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۳۸)

''اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے، تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے۔''

عربی زبان میں یہ وصف بدرجہ اتم موجود ہے کہ سیکھنے، سمجھنے اور ہدایت پانے والوں کے لیے یہ کوئی مشکل زبان نہیں ہے۔قرآن حکیم کی حسب ذیل آیت اسی حقیقت کو واضح کر رہی ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ. (۳۹)

''بے شک ہم نے اس قرآن کو عربی میں نازل کیا تا کہ تم سمجھو۔''

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مستشرقین نے مختلف عرب ممالک کے مقامی عربی لہجات کو الگ الگ زبان کا درجہ دلوانے کے لیے سر توڑ کوششیں کیں۔مثال کے طور پر پروفیسر John Haywood یمن میں کم وبیش بیس سال مقیم رہا اور یمن کی عربی زبان کی الگ شناخت کے لیے کوشاں رہا۔متعدد مستشرقین نے مصر، لیبیا، الجزائر، شام اور سعودی عرب جیسے ممالک کے مقامی لہجات کو الگ الگ زبانوں کے طور پر منوانے کے لیے الگ الگ کتب تحریر کیں۔چونکہ سبھی چھوٹے بڑے بائیس عرب ممالک کی دفتری زبان فصیح عربی ہی ہے، جو قرآن کے جلو میں ہمیشہ چلتی رہی ہے، چنانچہ مستشرقین کی کوئی کوشش بھی بار آور نہیں ہوئی، اور ان شاء اللہ اس کتاب عظیم کی برکت سے عربی زبان یونہی ایک زندہ زبان رہے گی۔

☆☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

۱۔ اقبال،علاّمہ محمد،کلیات اقبال فارسی،لاہور،شیخ غلام علی انڈ سنز، ۱۹۷۵،ص۱۲۱،۶۵۴، ۶۶۹۔

۲۔ ابن حنبل،احمد،مسندابن حنبل، بیروت،دار احیا التراث العربی ،الطبعۃ الثانیہ،۱۹۹۳ء/۱۴۱۴ھ، ج۶،ص ۲۲۶-۲۲۸۔

۳۔ القرآن ،طہ۲۰:۱۳۳۔

۴۔ القرآن ،الاعلیٰ۸۷:۱۸-۱۹۔

۵۔ الآلوسی،شہاب الدین محمود البغدادی،روح المعانی فی تفسیر القرآن المجید والسبع المثانی، بیروت ،دارالفکر، ۱۹۹۷ء/ ۱۴۱۷ھ،ج۱،ص۱۹۔ابو عبید،معمر، مجاز القرآن (تحقیق، فواد سیزگین)،مؤسسۃ الرسالۃ،الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۸۱ء/۱۴۰۱ھ، ج۲، ۲۷۸۔

۶۔ السیوطی،جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر،الاتقان فی علوم القرآن،الریاض،مکتبۃ المعارف ،الطبعۃ الاولیٰ ، ۱۹۹۶ء/ ۱۴۱۶ھ،ج۱،ص۱۹۹۔

۷۔ المصنّف السابق، المزہر فی علوم اللغۃ وأنواعھا،مصر،عیسی البابی الحلبی وأولادہ،الطبعۃ الثانیۃ، ج۱، ص۱۲۷۔

۸۔ المرجع السابق۔

۹۔ الطبری ،ابن جریر،جامع البیان عن تاویل ای القرآن،بیروت، دارالفکر، ۱۴۰۸ھ، ج۱، ص۸-۹۔السیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر،الاتقان فی علوم القرآن، ج۱، ص۳۳۔

۱۰۔ ایسے الفاظ جو بدیسی زبانوں سے لے کر عربی قالب میں ڈھالے گئے ہوں۔

۱۱۔ اس موضوع کو دور جدید کے مختلف نامور عربی لغت دان شرح و بسط کے ساتھ اپنی کتابوں میں زیر بحث لائے ہیں،جن میں سے خاص طور پر الدکتور صبحی الصالح کی دراسات فی فقہ اللغۃ اور الدکتور رمضان عبدالتواب کی شہرہ آفاق کتاب فصول فی فقہ العربیۃ قابل ذکر ہیں۔

12. Stetkevych, Jaroslav, The Modern Arabic Literary Language_Lexical and Stylistic Developments, The University of Chicago Press ,1970, p.1.

۱۳۔ عبد اللہ بن عباس، کتاب اللغات فی القرآن، تحقیق: صلاح الدین المنجّد، القاہرہ، ۱۹۴۶ء، ص۵-۷۔

۱۴۔ العجلونی، اسماعیل بن محمد، کشف الخفاء ومزیل الالباس، دمشق، مکتبۃ الغزالی، ب۔ت، ج۱، ص۷۰۔

۱۵۔ مطر، عبدالعزیز، لحن العامۃ فی ضوء الدراسات اللغویۃ الحدیثۃ القاھرۃ، ۱۹۸۱ء ص۱۷۔۳۶

۱۶۔ امیل یعقوب، معجم الخطأ والصواب ص۲۲۔۲۴

۱۷۔ الشاطبی، ابواسحاق ابراھیم بن موسیٰ الغرناطی المالکی، الموافقات فی اصول الشریعۃ، القاھرہ ۲۰۰۶ء ج۱، ص۳۲۱۔

۱۸۔ السیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج۱ص ۱۲۰

۱۹۔ القرآن، الکوثر ۱۰۸:۱-۳۔

۲۰۔ وافی، عبدالواحد، فقہ اللغۃ۔لجنۃ البیان العربی، ۱۳۸۸ھ، ص۱۰۸۔

ابن الانباری، محمد بن قاسم، کتاب الایضاح عن الوقف والابتداء، دمشق، ۱۹۷۱ء، ص۱۲۔

مزید تفصیل کیلئے دیکھئے: عمر فروخ، المنھاج فی الادب العربی وتاریخہ، بیروت، المکتبۃ العصریۃ۔

۲۱۔ القلقشندی، ابوالعباس، احمد بن علی، صبح الأعشی فی صناعۃ الأنشاء، دارالثقافۃ والارشاد القوافی، الموسسۃ المصریۃ، ب۔ت، ج۱، ص۱۴۹۔ البیہقی، الخصائص الکبری، بیروت، دارالفکر، ب۔ت، ص۱۱۵۔

۲۲۔ اقبال، علاّمہ محمد، حوالہ مذکور، ص۶۶۹۔

۲۳۔ مناع القطان، مباحث فی علوم القرآن، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، ب۔ت، ص۱۱۵۔

۲۴۔ ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ، بیروت، دارالفکر، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۹۷ء/ ۱۴۱۸ھ، ج۵، ص۲۸۔۳۳۔

۲۵۔ القرآن، القارعۃ، ۱۰۱:۱-۱۱۔

۲۶۔ الطبری، ابن جریر، تاریخ الطبری، بیروت، الموسسۃ العلمیۃ للمطبوعات، ۱۹۹۸ء/ ۱۴۱۸ھ، ج۳، ص۱۳۱۔

مصطفیٰ صادق ،الرافعی،اعجاز القرآن والبلاغۃ النبویۃ،بیروت ،دارلکتاب العربی، ب۔ت، ص۱۷۳۔۱۷۴۔

۲۷۔ الخطابی والجرجانی ،فی ثلاث رسائل فی اعجازالقرآن، مصر، دارالمعارف، ب۔ت، ص۵۰۔۵۵۔

۲۸۔ البقرۃ۲:۲۳۔

۲۹۔ واضح رہے کہ بہت سے عرب مسیحی ہیں، لبنان میں کم وبیش چالیس یا پچاس فی صد مسیحی آباد ہیں۔اسی طرح مصر میں بھی مسیحیوں کی کافی تعداد ہے۔

۳۰۔ القرآن،مریم۱۹:۵۸۔

۳۱۔ الانجیل للقدیس متیؔ ۲:۱۱،ص۱۲۔

۳۲۔ القرآن،یٰسین۳۶:۷۸۔

۳۳۔ الانجیل للقدیس متیؔ ۱۳:۳۱،ص۸۱۔

۳۴۔ القرآن،لقمن۳۱:۱۶۔

۳۵۔ الانجیل للقدیس متیؔ ۱۳:۳۱،ص۸۱۔

۳۶۔ القرآن، ق۵۰:۳۰۔

۳۷۔ طنطاوی،جوہری ،الجواہر فی تفسیر القرآن(بذیل سورۃ الاعراف:۱۸، سورۃ ق:۳۰)، بیروت ، داراحیاء التراث العربی ، الطبعۃ الرابعۃ،۱۴۱۲ھ۱۹۹۱ء۔

۳۸۔ القرآن ،القمر۵۴:۴۰۔

۳۹۔ القرآن، یوسف۱۲:۲۔

❁.....❁.....❁

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 31, Sr.No.79, 2010, pp 27 - 46

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۱، اپریل۔ جون ۲۰۱۰ء، شمارہ ۷۹

مثنوی رمز العباد کا ایک نادر اور نایاب مخطوطہ

پروفیسر ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد☆

Abstract:

Haji Muhammad Naushah Ganj Bukhash was a famous Sufi of the Punjab who also contributed a lot to Punjabi and Urdu languages. Masnawi namely "Gunj al Asrar or Ramz al Ibad" is a master piece of his sufi poetry in urdu. Some scholars doubt the attribution of the Masnawi to him. Luckily, the author of this research article somehow discovered a manuscript of Hazrat Nousha's poetry written in 11 th century al Hijra. The article is furnished with the text of the Masnawi along with a detailed discussion regarding the literary beauties of the said Masnawi.

جنوبی ایشیا کے اس خطے میں جن جلیل القدر اولیائے عظّام نے مخلوقِ خدا کی دینی و دنیاوی رہنمائی کے لیے علم و حکمت کے چراغ روشن کیے ان میں حضرت حاجی محمد المعروف بہ نوشہ گنج بخش قادریؒ کا نام نامی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ آپ ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء (۱) موضع گھگانوالی تحصیل پھالیہ ضلع گجرات (موجودہ منڈی بہاء الدین) میں پیدا ہوئے اور ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء میں وصال فرمایا(۲) مزار موضع رنمل شریف میں ہے۔آپ کے آباؤ اجداد اپنی

☆ چیئرمین، شعبہ پنجابی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور

خاندانی شرافت و نجابت اور تقویٰ و پرہیزگاری میں مشہور تھے۔ خصوصاً آپ کے والد بزرگوار حضرت شیخ علاؤ الدینؒ جنہوں نے سات بار پیدل حج کی سعادت حاصل کی اور آپ کے چچا شیخ رحیم الدینؒ نیکی و پارسائی میں یکتائے روزگار تھے۔ عہدِ مغلیہ کے نامور صاحبِ طرز ادیب محمد ماہ صداقت کنجاہی نے اُن کا ذکر یوں کیا ہے:

''دودمان مجموعہ کرامت ایشان، درقلمرو پنجاب بمشق صلاح وتقویٰ روشنائی دارد۔ و فہرست کمالات معانیٔ پنہانی ، آں صفاکیش ، چوں نوشتہ کراماً کاتبین محومنسی نتواند شد۔ خصوصاً شیخ رحیم الدین عم بزرگوار آں چراغ دودۂ کبارعم انوارہ ،کہ چوں معنی ، صاحب لفظ بودہ۔ ریاضت ذوالنون خمیدہ پشت و بجنب مجاہدۂ آں شمشیر قطع تعلقات چوں نوں تنوین، وجود نداشت، وقربانیٔ مقام ابراہیم فنافی اللہ یعنی شیخ علاء الدین ، قبلہ گاہ حاجیٔ کعبہ وجہ اللہ کہ جادہ پیمائی ابراہیم ادھم، چوں نقش مسطر، برائے بیت می شمرد، یک نفس بے سفر، کعبۂ قبلہ نما ، آرام دلش ممکن نبود۔ قامت خم گشتۂ او، برنگ حطیم ، زیارت گاہ داستان و دِل پُرشور زمزم دار، صفا بخشِ پاکبازاں۔ از رشک داغ عشق ، آں مشکیں کاکل مسکین نواز حجرالاسود در سوادِ کعبہ چوں خال چہرہ حبشی،مستور۔ وازشرمِ حق گزاریٔ آں ابن السبیل سعادت، دمساز، ام القریٰ، عروس وار بحیا مشہور۔ کعبۂ پشمینہ پوش، باستقبال آں لبریز، زمزمہ شورعشق، چوں صوفیٔ وجہ پرداز، از خویش می رفت۔ وکوہِ صفا تبعظیمِ آں گوہرِ کانِ صدق، مانند صدا، از سرخویش برمی خاست۔ شہرت برہفت حج آں دیباچہ ہشت بہشت برنگ سبعہ سیارہ حکم تواتر دارد ..... مجموعہ تقویٰ و طہارت ''بی بی جیونی'' والدۂ ماجدۂ آں ابوالوقت، آں قدر جدوجہد عصمت و پاکی داشت کہ توحیدِ رابعۂ بصری پیش

تفرید آں یگانہ عصر صفروار در ہیچ شمار نبود۔''(۳)

آپ کے والد اور چچا اپنے آبائی علاقہ موضع پنن وال (تحصیل پنڈ دادن خاں) سے ہجرت کر کے گھگانوالی میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ اشرف منچری کی کنز الرحمت (قلمی) اور حضرت نوشہ گنج بخشؒ کی اولاد میں سے سائیں حسن محمد کی تصنیف تحائف اصفیاء سے بھی اسی حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔ بقول سائیں حسن محمد:

پنن وال پہلے تھا آرام گاہ
وہاں راجپوتوں کا تھا عزو جاہ
حضرت بھی خود راجپوتوں میں تھے
ولے اقرباؤں کو نہ جانتے(۴)

آپ نے ابتدائی تعلیم قریبی گاؤں جاگو تارڑ کے مدرسہ سے حاصل کی اور بعد ازاں باطنی تربیت کے لیے بھلوال جا کر سلسلہ قادریہ کے معروف روحانی بزرگ حضرت شیخ سلیمان نوریؒ حضوری کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ آپ ایک عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے اور مرشد کامل کی نگرانی میں سلوک کی منازل طے کیں۔ مرشد نے خلافت و اجازت سے نوازا اور انہیں نوشہرہ تارڑاں میں اپنا تبلیغی مرکز قائم کرنے کا حکم دیا۔

آپ کے خلفاء کی ایک قابل ذکر تعداد پنجاب، کشمیر اور افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی چنانچہ آپ کی تبلیغی کوششوں سے ہزاروں افراد کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ آپ نے وعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ آپ کی تصانیف ایک عرصہ تک پردہ اخفا میں رہیں مگر اب ان میں سے اردو مثنوی گنج الاسرار ۱۹۶۴ء میں، پنجابی نثری وعظ مواعظ نوشہ کے نام سے ۱۹۶۸ء اور ۱۹۷۳ء میں اردو شاعری انتخاب گنج شریف ۱۹۷۵ء میں ملفوظات چہار بہار فارسی ۱۹۷۹ء اور پنجابی شاعری گنج شریف پنجابی ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔

مثنوی گنج الاسرار مذکور بہت سے دیگر ناموں سے متعارف رہی ہے۔ جیسے بیان اشغال، رمزالعشق، گیان لہر، رمزالعباد، واحد نامہ، کلام الملوک، وحدۃ نامہ، بیان تصوف، نسخہ طریقت اور راہ سلوک وغیرہ۔ آپ کی شاعری انتخاب گنج شریف اور خصوصاً مثنوی گنج الاسرار (رمز العباد) کے بارے میں خورشید احمد خاں نے اورینٹل کالج میگزین صد سالہ نمبر۱۹۸۲ء میں ایک مقالہ ''حضرت نوشہ گنج بخشؒ سے منسوب اردو شاعری کی اصل حقیقت'' کے عنوان سے لکھا۔ جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ یہ اردو کلام نوشہ صاحب کا نہیں خصوصاً گنج الاسرار غلام محی الدین میر پوری کی تصنیف ہے۔ اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ کوئی ایسا مخطوطہ موجود نہیں جو یہ شہادت پیش کر سکے کہ یہ غلام محی الدین میر پوری کی تصنیف (۱۱۳۱ھ) سے قبل کا تحریر شدہ ہے۔ راقم نے ۱۹۸۸ء میں اپنا پی ایچ-ڈی کا مقالہ'' نوشہ گنج بخش حیاتی ،فکر تے فن'' مکمل کیا تو اس کے دوسرے باب میں مثنوی کی زبان اور اندرونی شہادتوں کی بنا پر اسکا مدلل جواب دے کر ثابت کیا تھا کہ گنج الاسرار نوشہ گنج بخشؒ کی ہی تصنیف ہے اور غلام محی الدین میر پوری نے اس کے تتبع میں اپنی گنج الاسرار لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس وقت تک کوئی ایسا مخطوطہ راقم کی نظر سے بھی نہیں گزرا تھا جو ۱۱۳۱ھ سے قبل کا ہو۔ البتہ راقم السطور نے اس امر کا اظہار ضرور کیا تھا کہ نوشہ صاحبؒ کی اولاد میں سے محترم برق نوشاہی مرحوم نے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ انہوں نے موضع چومک آزاد کشمیر کے ایک نجی کتب خانے میں گنج الاسرار کا ایک مخطوطہ ضرور دیکھا تھا جس پر ۱۱۰۷ھ درج تھا اور گنج الاسرار کے اشعار نوشہ صاحب کے نام سے ہی تحریر تھے۔ اس مخطوطے کا آزاد کشمیر کے علاقے میں موجود ہونا اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ حضرت نوشہؒ کے مرید و خلیفہ حضرت عبداللہ چومکیؒ اور حافظ طاہرؒ اس علاقے میں قیام پذیر تھے اور مخلوق خدا کی دینی و روحانی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ نیز نوشاہی فقراء نے چونکہ ساڑھے تین سو سال سے اسے نوشہ صاحبؒ کی تصنیف سمجھتے ہوئے اپنے ذکرفکر کے لیے اپنا رکھا ہے اور بہت سے درویشوں کو یہ حفظ ہے اور وہ اپنے سالکین کو اس کا درس بھی دیتے ہیں۔

اس لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ نوشہ صاحبؒ کی ہی تصنیف لطیف ہے۔ مگر اب اس حقیقت کی تصدیق کے لیے ایک اور نا قابل تردید تحریری ثبوت رمز العباد (گنج الاسرار) کے نو دریافت شدہ قلمی نسخے کے روپ میں مل گیا ہے۔

نسخے کا تعارف

دو سال قبل محترم دیوانِ شاہ ہمدان سید وقار علی حیدر ہمدانی نوشاہی (قصور) کے توسل سے رمزالعباد (گنج الاسرار) کا ایک قلمی نسخہ ملا۔ اب تک دریافت ہونے والے نسخوں میں یہ شاید قدیم ترین ہے۔ کیونکہ اس پر سن تحریر ۱۱۰۰ ہجری درج ہے۔ موٹے اور کھردرے سفید کاغذ کے پانچ اوراق پر مشتمل اس نسخے کا سائز ۲۵ × ۱۶- س.م ہے۔ پہلے ورق پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے نیچے خط نسخ میں کلام الملوک، ملوک الکلام اور پھر عربی سٹائل میں رمز العباد جلی قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس کے نیچے ورق کے عین وسط میں باریک قلم میں تصنیف لطیف اور خط نستعلیق میں نمایاں قلم سے حاجی محمد نوشہ گنج بخش مجدد اعظم رنمل شریف گجرات، لکھا ہے آخر میں مرتب کا نام یوں تحریر ہے:

''فقیر سید جمال شاہ گیلانی قادری نوشاہی ساکن ہیبت پور پٹی در شہر قصور''

یہ نسخہ فقیر سید جمال شاہ گیلانیؒ (م ۱۱۶۲ھ) کے اپنے ہاتھ کا تحریر کیا ہوا ہے کیونکہ پہلے ورق کے پشت پر آٹھ سطور میں درج ہے۔

''باسمہٖ تعالےٰ

مسمیٰ الفقیر سید جمال شاہ گیلانی عرض گزار ہے کہ میں نے رمزالعباد اپنے پیر و مرشد جناب حضرت پیر سچیار قادری نوشاہی کی ذاتی بیاض سے نقل کیا ہے۔

درنقل شدہ نسخہ تاریخ ۷۔ ربیع الاول ۱۱۰۰ھ ہجری ''ذوالجلال والاکرام''

آستانہ عالیہ قادریہ نوشاہیہ ہیبت پور پٹی در شہر قصور''

دوسرے ورق سے مثنوی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد

رمزالعباد جلی قلم میں اور پھر درمیانی قلم سے خط نستعلیق میں پہلا شعر یوں درج ہے:

''جس ذات کا اللہ ناؤں اس کا تجھے بتاؤں تھاؤں''

کتاب کے نام اور پہلے شعر کے گرد سنہرے بیل بوٹے کا کام ہوا ہے۔ ورق کے بقیہ حصے پر پانچ اشعار درج ہیں۔ ورق ۲۔ ب تا ورق ۵۔ الف ،۱۲۔سطور فی صفحہ، جبکہ ورق ۵۔ب پر دس سطور یعنی آٹھ اشعار رقم کیے گئے ہیں۔ آخری شعر:

رمز العباد ہے اس کا نام
نوشہ ظاہر کیے تمام

آخری شعر کے علاوہ پورے نسخے میں کہیں کہیں بعض اشعار کے گرد بھی سنہرے کا کام کیا گیا ہے۔

افادیت

اس نسخے کی افادیت کئی حوالوں سے بنتی ہے:

۱۔ اب تک دریافت ہونے والے نسخوں میں یہ سب سے قدیم ترین ہے۔

۲۔ اس پر سن تحریر ۱۱۰۰ ہجری درج ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرت نوشہ گنج بخشؒ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی نقل کیا گیا ہے کیونکہ حضرت نوشہؒ کا سال وفات ۱۱۰۳ ہجری ہے۔

۳۔ مخطوطے کا اصل ماخذ حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے خلیفہ حضرت پیر محمد سچیارؒ (وفات ۱۱۲۰ھ) کے پاس تھا۔ جو یقیناً انہیں اپنے مرشد نوشہ صاحبؒ کی بارگاہ سے عطا ہوا ہوگا۔

۴۔ سید جمال شاہ گیلانی نے جب یہ نسخہ نقل کیا تو اس وقت نوشہ صاحبؒ موضع رنمل میں رہائش پذیر تھے کیونکہ ٹائٹل پر رنمل شریف گجرات کا ذکر موجود ہے۔

۵۔ سید جمال شاہ گیلانی نے جب یہ نسخہ نوشہ صاحبؒ کی حیات مبارکہ میں نقل کیا ہے تو انہیں اپنے دادا مرشد (حضرت نوشہؒ) کی زیارت کا شرف بھی ملا ہوگا۔

۶۔ نسخہ نقل کرتے وقت جن لفظیات کی سہواً تبدیلی واقع ہوئی، اس کے متبادل اصل لفظ

ہاشیہ میں درج کیے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ تین چار لفظ ہی ہیں۔

۷۔ ورق ۵۔الف پر اُن حروف مقطعات کی وضاحت ہے جو سالک کو سجدے کی حالت میں پڑھنے ہوتے ہیں بلکہ ان کو کتنی تعداد میں پڑھنا ہے اس کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔

۸۔ رمز العباد کا یہ نسخہ سید جمال شاہ گیلانیؒ کے اپنے ہاتھ کا نقل کردہ ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ نہ صرف ظاہری و باطنی علوم میں یگانہ بلکہ عمدہ خطاط بھی تھے۔

۹۔ ۸۷۔اشعار پر مشتمل اس نسخے کے مل جانے سے یہ تحقیق بھی ہو سکے گی کہ مطبوعہ نسخہ جات میں الحاقی اشعار کونسے ہیں اور ان کی تعداد کتنی ہے اور انہیں کس عہد میں رمز العباد کا حصہ بنایا گیا۔

۱۰۔ اس نسخے کا متن مکمل ہے اور خوبصورت خط نستعلیق میں ہے۔ اس لیے پڑھنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی۔

۱۱۔ ۱۱۰۰ہجری میں نقل کیے جانے والے اس مخطوطے کے پہلے ورق پر رمز العباد تصنیف لطیف حاجی محمد نوشہ گنج بخش مجدد اعظم رَمل شریف لکھا ہے۔ اگر آپ اُس وقت تک رحلت فرما چکے ہوتے تو نام کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ ضرور لکھا ہوتا۔ اس سے یہ حقیقت بھی اظہر من الشّمس ہوتی ہے کہ آپ اپنی ظاہری حیات میں ہی رَمل شریف تشریف لے آئے تھے اور یوں محکمہ مال کے کاغذات میں درج اس بیان کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے جو موضع رَمل کی مسل حقیت سے متعلق ہے کہ:

> ''مسمی نوشہ صاحب فقیر قوم راجپوت گوت جالپ بطور سیاحی اس جگہ آیا۔ لب دریا مکانات ومسجد وغیرہ بنوائی۔ صدمہ دریا سے وہ مکان بُرد ہوگئے، پھر بعد مرنے نوشہ صاحب فقیر کی اولاد اس کی خانقاہ ومسجد وغیرہ مکانات بعمارت پختہ بنائے تب سے یہ قوم فقیر نوشاہی بھی مالک ہے اور دیگر اقوام متفرق مندرجہ شجرہ نسب بندوبست گزشتہ میں پیش گاہ صاحب سپرنٹنڈنٹ سے مالک بن گئے۔ کیفیت مفصل محاذ نام ان کے درج ہے۔'' بلفظہٖ (۵)

رمز العباد کی ادبی و لسانی اہمیت

یہ سچ ہے کہ دیگر بزرگان دین کی طرح نوشہ صاحبؒ نے بھی شاعری کو اپنے صوفیانہ افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کے ہاں فن کی حیثیت ثانوی ہے۔ مگر تبلیغ و اشاعتِ دین میں خودبخود ادبی و لسانی نکھار پیدا ہوتا رہا ہے۔ اگرچہ ان بزرگانِ دین کا تعلق اسرار و رموزِ شعر سے باقاعدہ اُن شعراء کی طرح نہ تھا جو شاہی درباروں کی سرپرستی میں فنِ شعر کی زلفیں سنوارتے رہے۔ لیکن جب چاروں طرف شعر و ادب کی تحسین ہو رہی تو معاشرے کا ایک اہم فرد ہونے کے ناطے صوفیا بھی اس کے اثرات سے مبرا نہیں ہو سکتے تھے۔ شاید اسی سبب ایسے صوفیانہ کلام میں بہت سی ادبی و لسانی خوبیاں پیدا ہوگئی ہیں، جو رمز العباد میں بھی نظر آتی ہیں۔ مگر انہیں سمجھنے کے لیے اُردو مثنوی نگاری کے سیاسی ، سماجی اور تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

بہمنی سلطنت کے روبہ زوال ہونے کے نتیجے میں گولکنڈہ ، بیجاپور اور احمد نگر کی ریاستوں کا وجود عمل میں آیا تو قطب شاہی حکمرانوں کے ہندو خاندانوں کے ساتھ راہ و رسم بھی بڑھنے لگے اور یوں مقامی زبانوں کا اُس دور کی اردو زبان پر اثر انداز ہونا فطری امر تھا۔ جس کے بعد اردو کا نیا روپ سامنے آنے لگا۔ ان ریاستوں کے حاکم نہ صرف خود شاعر تھے بلکہ شعر و ادب کی سرپرستی ان کا طُرۂ امتیاز تھا۔ غواصی ، ملاّ قطبی، ابن نشاطی، جنیدی، طبعی، فائز مرزا اور مومن جیسے نامور شاعروں کو گولکنڈہ کے دربار کی سرپرستی حاصل ہے۔ خود قلی قطب شاہ کے اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل دیوان میں مثنوی، قصیدہ، ترجیع بند اور رباعی ملتی ہے۔ گویا ان اصناف سخن کا رواج مقبولیت حاصل کر رہا تھا جن میں فطری مناظر، مجازی و حقیقی عشقیہ رنگ کے علاوہ مقامی ثقافتی حوالے ، خوبصورت تشبیہات و استعارات کے ساتھ موجود تھے۔ بلکہ رام بابو سکسینہ نے تو یہ گمان بھی ظاہر کیا کہ قطب شاہی عہد سے پہلے بھی مذہبی مثنویاں موجود تھیں مگر وہ کسی ادبی درجہ کی حامل نہ تھیں۔(۶) آگے چل کر ولی دکنی کے کلام میں فارسی تشبیہات ، استعارے

اور ہندی تراکیب کے ساتھ ساتھ خالص پنجابی کے الفاظ، ترکیبیں اور محاورے، اس کی شاعری کے حسن میں اضافہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ قلی قطب شاہ کے داماد اور جانشین سلطان محمد قطب شاہ اور پھر اس کے بیٹے سلطان عبداللہ شاہ کے عہد میں روایتی قصے مثنوی کے انداز میں عام لکھے گئے۔ ابن نشاطی کی مثنوی ''پھول بن''، غواصی کی ''سیف الملوک''، ''طوطی نامہ''، جنیدی کی '' ماہِ پیکر''، طبعی کی '' بہرام وگل اندام''، تحسین الدین کی '' قصہ کامروپ'' اور فائز کی ''قصہ رضوان شاہ'' اسی دور یعنی سترھویں صدی عیسوی کی یادگار ہیں۔

بیجاپور کے حکمران بھی علم و ادب کی سرپرستی میں کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں تھے۔ ابراہیم عادل شاہ نے شاعری کے ساتھ ساتھ فن موسیقی کو بھی عروج دیا۔ البتہ شاعری کے میدان میں اس دور کو ایک خوبی جو سب سے نمایاں کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مذہبی اور صوفیانہ مضامین مثنوی کا دامن بھرنے لگے۔ چنانچہ سید میراں ہاشمی کی ضخیم مثنوی یوسف زلیخا (۱۶۸۷ء)، شاہ ملک کا رسالہ احکام الصلوٰۃ (۱۶۷۵ء)، شا امین کے دو رسالے قربیہ اور وجودیہ، قاضی محمود بحری کی مثنوی '' من لگن'' (۱۷۰۰ء)، اسی رنگ کی آئینہ دار ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق کے مطابق شمالی ہندوستان میں سب سے قدیم مثنوی اسماعیل امروہوی کی ''تولد نامہ حضرت فاطمہؓ '' ہے جو ۱۰۵۴ھ تا ۱۱۲۳ھ کے درمیان لکھی گئی ہے مگر:

> '' ادبی اعتبار سے اس کتاب کی کوئی اہمیت نہیں۔ بہت ہی معمولی درجے کی ہے۔ لیکن اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دلی کے آس پاس کے اضلاع اور قصبات میں زبان کیسی تھی۔'' (۷)

اسماعیل امروہوی کی ایک اور مثنوی ''معجزہ انار'' کا ذکر بھی ملتا ہے۔ حامد اللہ افسر نے شمالی ہند میں میر تقی میر (پ ۱۱۳۷ھ) کو مثنوی کا پہلا شاعر قرار دیا ہے(۸) جبکہ سید مسعود حسن رضوی کی رائے میں یہ اعزاز فائز دہلوی کو جاتا ہے جس نے مثنوی '' قصہ رضوان شاہ'' ۱۰۹۴ھ میں لکھی۔(۹) اس کے مقابلے میں دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ رمز العباد (گنج الاسرار)

۱۰۵۰ھ تا ۱۰۶۰ھ کی تصنیف ہے۔(۱۰) ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے خیال میں نوشہ صاحبؒ نے اسے ۱۰۶۴ھ میں تصنیف کیا ہے۔ (۱۱) یوں اس کی لسانی و تاریخی اہمیت دیگر مثنویات سے کہیں زیادہ ہے۔

اس پورے پس منظر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ گیارہویں صدی ہجری میں پورے ہندوستان میں اردو شعر کی جو صورت تخلیق ہو رہی تھی اس پر ہندی، سنسکرت ، پنجابی ، بھاشا اور دیگر مقامی لہجوں کے اثرات بہت گہرے اور نمایاں تھے، مگر پنجاب کے مرکزی علاقے میں جو اُردو شاعری تخلیق ہو رہی تھی وہ اس لحاظ سے قدرے صاف، رواں اور عام فہم تھی کہ اس کا جھکاؤ زیادہ تر فارسی زبان و تہذیب کی طرف ہوتا جا رہا تھا اور اس کا عکس نوشہ صاحبؒ کی مثنوی میں الفاظ و اصطلاحات کی صورت نظر آتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ:

> ''گیارہویں صدی ہجری میں ہمیں مثنوی ، غزل اور مخمس بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ ہم واضح طور پر محسوس کرنے لگتے ہیں کہ فارسی تہذیب، ہندوی تہذیب پر غالب آ گئی ہے۔ اب ہندوی اصناف سخن اور بحور ٹکسال باہر ہو رہے ہیں اور فارسی اصناف و بحور ان کی جگہ لے رہے ہیں۔ حاجی محمد نوشہ گنج بخشؒ کی مثنوی گنج الاسرار، شاہ مراد خانپوری اور رحمان بابا کا کلام اور عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی کی غزلیں اسی تہذیبی اثر کی واضح مثالیں ہیں۔''(۱۲)

رمز العباد (گنج الاسرار) کا لسانی و فنی حوالے سے مطالعہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ:

> ''مناسب اور موزوں قوافی کے استعمال کے علاوہ اشعار میں بے حد روانی اور تسلسل ہے۔ الفاظ کا صوتی آہنگ مثنوی کے اشعار میں ترنم اور موسیقی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ مثنوی کی زبان پر (کسی حد تک) ہندی کا گہرا اثر ہے۔ اسی بنا پر محترم شرافت نوشاہی مرحوم نے اس مثنوی کی زبان کو

ہندی قرار دیا ہے حالانکہ یہ ہندی نہیں بلکہ اُس دور کی اُردو کا بہترین نمونہ ہے۔ جسے قدیم زمانے میں ہندوی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔'' (۱۳)

پروفیسر شجاع الدین نے اس مثنوی کی زبان پر بہت ہی عمدہ اور پختہ رائے قائم کی ہے کہ:

''سر زمین پاکستان و ہند پر اسلام کا نیّر درخشاں طلوع ہوا تو مسلمان حاکموں، تاجروں سیاحوں، عالموں، درویشوں اور مقامی باشندوں میں تبادلہ خیالات کے لیے ایک مشترکہ زبان کی ضرورت پیش آئی۔ یہ زبان جو ہندو پاکستان اور ترکی ، عربی ، فارسی وغیرہ بیرونی زبانوں کے امتزاج سے عالم وجود میں آئی اور دور اسلامیہ میں پروان چڑھی ، اردو کے نام سے موسوم ہوئی.....صوفیاء کرام نے اردو کی نشوونما میں نمایاں حصہ لیا اور اسے اپنی تبلیغی مساعی کا ذریعہ بنایا۔ پنجاب کے مشائخ میں حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے بھی اس مشترکہ زبان میں اظہار خیال فرمایا۔ رسالہ گنج الاسرار اسی زبان میں ہے۔ اس رسالہ کا مطالعہ جہاں ہمیں حضرت نوشہ صاحبؒ کے صوفیانہ خیالات سے آگاہ کرتا ہے۔ وہاں ہمیں اس دور کی اردو بھی متعارف کراتا ہے۔ اس عبارت میں ہندی الفاظ، اصطلاحات کی کثرت ہے اور یہ اصطلاحات وہی ہیں جو اس زمانہ کے ہندو مذہبی رہنماؤں (جن میں سکھ گورو بھی شامل ہیں) کے ہاں بھی مستعمل تھیں، عوام میں پرچار کے لیے ان کا استعمال ناگزیر تھا۔'' (۱۴)

ادبی ولسانی حوالے سے قطع نظر 'رمزالعباد' فکری پہلو سے بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں نوشہ صاحبؒ نے سلسلۂ نوشاہیہ کے درویشوں کے لیے ذکر فکر کے طریقے بتائے ہیں اور اس کی تصنیفی غرض و غائیت یوں بیان کی ہے:

محض خدا رسولؐ کی خاطر یہ نسخہ میں کیتا ساطر
غرض میری ہے بیان شواغل تقدیم تاخیر میں نہ ہو غافل (۱۵)

اگر یہ کہا جائے کہ یہ مثنوی نوشہ گنج بخشؒ کے ظاہری و باطنی علم کا بہترین مرقع ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس میں کلام خدا کی برکت، حدیث شریف، کلمہ طیبہ کا ذکر اور اسکا صحیح طریقہ، مرشد کی تلاش اور اطاعت، مرشد کی ذمہ داریاں ، طالب کے فرائض ، خلوص، نیک نیتی، سوز و گداز، عشق، کشفِ قبور، عالمِ برزخ، ذکرِ حق، تہجد، فنا فی الوجود، فنا فی المرشد، فنا فی اللہ اور عارف باللہ کی پہچان وغیرہ پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں شغلِ محمودہ، شغلِ نصیرا، شغلِ مدور، ذِکر سہ پایہ، ذِکر اِسم اعظم اور ذکرِ قصیدہ غوثیہ کا طریقہ بیان کیا ہے۔ یہ وہ تمام رموز ہیں جن کو نوشہ صاحبؒ نے اس انداز سے نظم کیا ہے کہ یہ مثنوی تقریباً ساڑھے تین سو سال سے نوشاہی درویشوں کا وظیفہ بن چکی ہے۔

زیرِنظر قلمی نسخہ اب تک سامنے آنے والے نسخوں سے نہ صرف قدامت کے لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے کہ اس کا متن مکمل ہے۔ اس کا معاصر کوئی اور نسخہ منظر عام پر نہیں ہے اس لیے کسی اور سے متن کا تقابل ممکن نہیں۔ چنانچہ اس کا متن من وعن قارئین کی نظر کیا جا رہا ہے۔

رمز العباد

متن

جس ذات کا اللہ ناؤں اس کا تجھے بتاؤں تھاؤں ورق۲۔الف
کم ایک سے تین ہزار اتنے نام دھرے کرتار
اتنے ہووں جس کے ناؤں کیونکر چھپتا اس کا تھاؤں
ظاہر دسے عالم کچا کیونکر چھپتا صاحب سچا

حق ہے باقی عالم فانی فانی کی ناں رہی نشانی
وحدت نوں توں کر تحقیق اس کوں من سوں کر تحقیق (تصدیق)
ایس مکان کوں پہنچن مشکل سخت راہ ہے دُور ہے منزل ورق۲۔ب
بہت ریاضت محنت طاعت دل حاضر راکھے ہر ساعت
فضل خدا کا ار توفیق جب سالک کوں ہووے رفیق
تب پہنچے اس راہ سعادت علم موافق کرے عبادت
طاعت اوہ جو پیر فرماے اپنا کیا کچھ کام نہ آوے
دارو وہ جو دیوے حکیم آپ دارو کیا کرے سقیم
کلام خدا کی دارو کھاناں جس جاناں برحق کر ماناں
جو افکار افکار افعال جو اوراد وظائف اعمال
جو حروف کلمات عظام جو آیات اسماء کرام
جو آویں بندیوں کے کام دین دنیا میں ہوویں تمام
سب قرآن مجید میں آئے حق تعالیٰ نے آپ فرمائے
توں کیا جانیں میرے کام
کون آیت ار کون ہرنام
کون شغل ار کونسا ذکر کونسا عمل ار کونسا فکر ورق۳۔الف
توں اندھلا تجھ کوں کیا سُوجھے بھلے بُرے کوں توں کیا بُوجھے
سر ہویّت خوب پچھان یہ نکتہ تو دل سیں مان
جے چاہیں بے رنگی بھیکھ ستگور کا توں چہرہ دیکھ

جو فرمائے تجھ کو پیر اس پر چلیں توں ہو فقیر (تجھ کوں پیر)
محض خدا رسول کی خاطر
یہ نسخہ میں کیتا ساطر

جس پر چاہیئے تجھ کو رہنا وہ ضرور ہویا اب کہنا
ادھی رات اُٹھ بیٹھے سالک چار کونٹ کا ہووے مالک
پیچھے اسکے سمجھ سیانے سلاح مومن کا وضو پچھانے
کرے تہجد نال نیاز دل حاضر ار جان گداز
دو رکعت جب پڑھ کر رہے ذکر فکر میں ہو کر رہے
لاَ اِلَه اِلاَّ اللّٰه سادھے من سُوں اُس دم سب کچھ چھاڑے
ایسی ضرب اللہ کی لاوے جو خطرہ ہے سب جھڑ جاوے ورق۳۔ب
لَا اِلَه کی پھڑ شمشیر تاں وچ عالم سارے پھیر
لَا اِلَه کی پکڑ بہاری گرد دھند سب دُور اتاری
محمَّد رَّسُول اللّٰه من بھیتر اگم پنتھ ستگور توں لئے
کہے
ایک ہزار یا تین ہزار کلمہ پاک کرے تکرار
چوبیس ہزار جو کوئی کرے انت کال بھی اس سیں ڈرے
پُرسش اس کی پیر سُوں پاوے جو لکھے موں رسم نہ آوے
جیوں کر پیر کرے تلقین لاگ رہے جیوں جل میں مین
ذکر غیب توں سن لے پیارے اللہ تیرے کام سنوارے

اچپا جاپ ہے جس نے کینا مکت پرابت اس نے لینا
جیس ترکٹی شغل پچھان عامل ہے سلطان جہاں
دونو دیوے پھر الٹاوے محراب بھواں کے بیچ لیاوے
ترکٹی کے سنگ آنکھ لگاوے جو پھل چاہے سوئی پاوے ورق۴۔الف
ترکٹی کے تم دو گھر جانوں محمودا اور نصیرا مانوں
طرف محمودہ رکھے دھیان کوئی ویلے شغل پچھان
سانس کرن جھمک پرتسیان ایس عمل کا رکھ دھیان
شغل محمودا اور نصیرا پلک نہ جھپکے اسمیں بیرا
نوک ناک پر نظر ٹکاوے عالم نظر سراب جیوں آوے
شغل فوارہ میرے میتا جتنا ہووے اتنا کیتا
شغل غوطہ ہے بہت غریب شغل غوثیہ جان عجیب
صور علمیہ کر توں خیال تاں توں ہوویں مرد کمال
کشف قبور اک شغل سنایا کشف فرقان بھی نال بتایا

جسم فنا کر توں یار
اپنے گھر سے ہو جا پار

اوہاں بیٹھ کر کرے نماز جگمگ جوت ار ناز نیاز
فجر تلک ایسا ہی رہے آسن سادھ سیدھا ہو بہے ورق۴۔ب
ذکر سہ پایہ کرے مدام برزخ کہتے اسکوں عام
ذکر ثلاثہ مغز بے مول غنچہ کھڑ کر ہووے پھول

اسم اعظم بہہ پیچھے پڑھے　　تو یہ ساگر سکھ سوں ترے
تیں کلمے ار چوداں حرف　　جوں سورج پگھلاوے برف
اس سیں ظاہر کیوں کر کہیے　　سِر چھُپے تو عارف رہیئے
سر جاوے پر سِر نہ جاوے　　تو یہ سِر ، سِر کوں پاوے
فجر ہووے تو پڑھے نماز　　سنت فرض میں کرے نیاز
ایسا راز اللہ کوں کہے　　آپ بیچ سوں جاتا رہے
اللہ اللہ اتنا کہے
آپ نہ رہے تے اللہ رہے

سوا پہر بیٹھے ات سار　　تاں پہنچے اونچے دربار
سوا پہر پر جب ہووے پورا　　سالک ہووے پورا سُورا　　ورق ۵۔الف
نفل ضحیٰ کے پھیر گذارے　　دین دنی کے کام سنوارے
تیں کلمے ار چوداں نام　　سجدے میں توں پڑھے مدام
پنجے وقت نماز پچھانے　　تاں اوہ حاضر خاوند جانے
سنت عصر کی ترک نہ کرے　　تو گوئے میدان سوں کھڑے
بعد عصر کے چُپ کر رہے　　شام تلک ایہ حاضر بہے
سن توں بات نوں کر کے دھیان　　اس میں کیا ہے رمز نہان
گم کر اپنا آپ اے غافل　　جسے ہونا ہے حق کا واصل
لیکن سمجھ نہ گور بِن آوے　　ستگور باہجھ یہ سوجھ نہ پاوے
عارف کامل راہ بتلاوے　　ارد برد کوں خوب چھپاوے

دھن دھن بھاگ میں مرشد پایا سروپ روپ جس منہ وکھایا
سنگت گور سیں میں بلہاری
بھرم دوئی کا مارن ہاری
ستگور پورے راہ بتایا تاں میں بھیت محبت پایا ورق ۵۔ب
لب سَیں یار کی میں مدھ پیتا خمار اس کے نے بیخود کیتا
اس سیں اظہر کیا بیان سر چھپے تو عارف جان
غوث الاعظم کرپا کیتی
جو یہ نعمت مجھ کوں دیتی
نام اسکے میں صدقے جاواں جاں اپنی نوں گھول گھماواں
اس کا اسم سے اسم خدا کیا ہو اسکی صفت ادا
پاک نبی تے لاکھ درود آل اتے اصحاب شہود
رمزالعباد ہے اس کا نام
نوشہ ظاہر کئے تمام

O

☆☆☆☆

حوالے

۱۔ عصمت اللہ زاہد پروفیسر ڈاکٹر: حضرت نوشہ گنج بخش حالات و آثار؛ سنگھوئی جہلم، ۲۰۰۹ء ص ۲۷

۲۔ مقامی اہل قلم کے علاوہ ایران سے تعلق رکھنے والے محمد معصوم شیرازی کی طرائق الحقائق جلد ۳ مطبوعہ کتاب خانہ سنائی ایران کے ص ۱۱۶ پر بھی یہی درج ہے: ''وفات نوشہ سال یکہزار و یکصد و سہ بودہ در عہد سلطنت اورنگ زیب عالمگیر ہندی''

۳۔ محمد ماہ صداقت کنجاہی (م ۱۱۴۸ھ/ ۳۵ ۱۷ء): ثواقب المناقب؛ تصنیف ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی شامل اورینٹل کالج میگزین، جنوری ۱۹۶۰ء ص ۷۷۔۷۶

۴۔ سائیں حسن محمد: تحائف اصفیاء، ۱۹۴۲ء

۵۔ مسل حقیت موضع رنمل ریکارڈ محکمہ مال تحصیل پھالیہ، بلفظہٖ

۶۔ رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو؛ پنجاب پریس لاہور، ۱۹۲۹ء ص ۹۷

۷۔ عبدالحق ڈاکٹر: مضمون بعنوان شمالی ہند کی سب سے قدیم مثنوی۔ مطبوعہ در سہ ماہی رسالہ اُردو، کراچی، جنوری ۱۹۵۴ء ص ۶

۸۔ حامد اللہ افسر: نقد الادب، ص ۱۶۶ ۹۔ تاریخ ادب اردو؛ ص ۱۹۶

۱۰۔ حضرت نوشہ گنج بخش احوال و آثار؛ ص ۲۲۱

۱۱۔ گوہر نوشاہی ڈاکٹر: مثنوی گنج الاسرار اردو کی ایک قدیم مثنوی۔ مطبوعہ در سہ ماہی صحیفہ، لاہور، اپریل ۱۹۶۶ء ص ۵۷

۱۲۔ جمیل جالبی ڈاکٹر: پاکستان کی قدیم اردو شاعری؛ لاہور ۱۹۷۶ء ص ۱۳۔۱۲

۱۳۔ حضرت نوشہ گنج بخش احوال و آثار؛ ص ۲۷۔۲۲۶

۱۴۔ نوشہ گنج بخش حاجی محمدؒ: گنج الاسرار؛ مرتبہ شرافت نوشاہی، ساہنپال گجرات ۱۹۶۴ء ص ۶

۱۵۔ ایضاً ص ۳۱

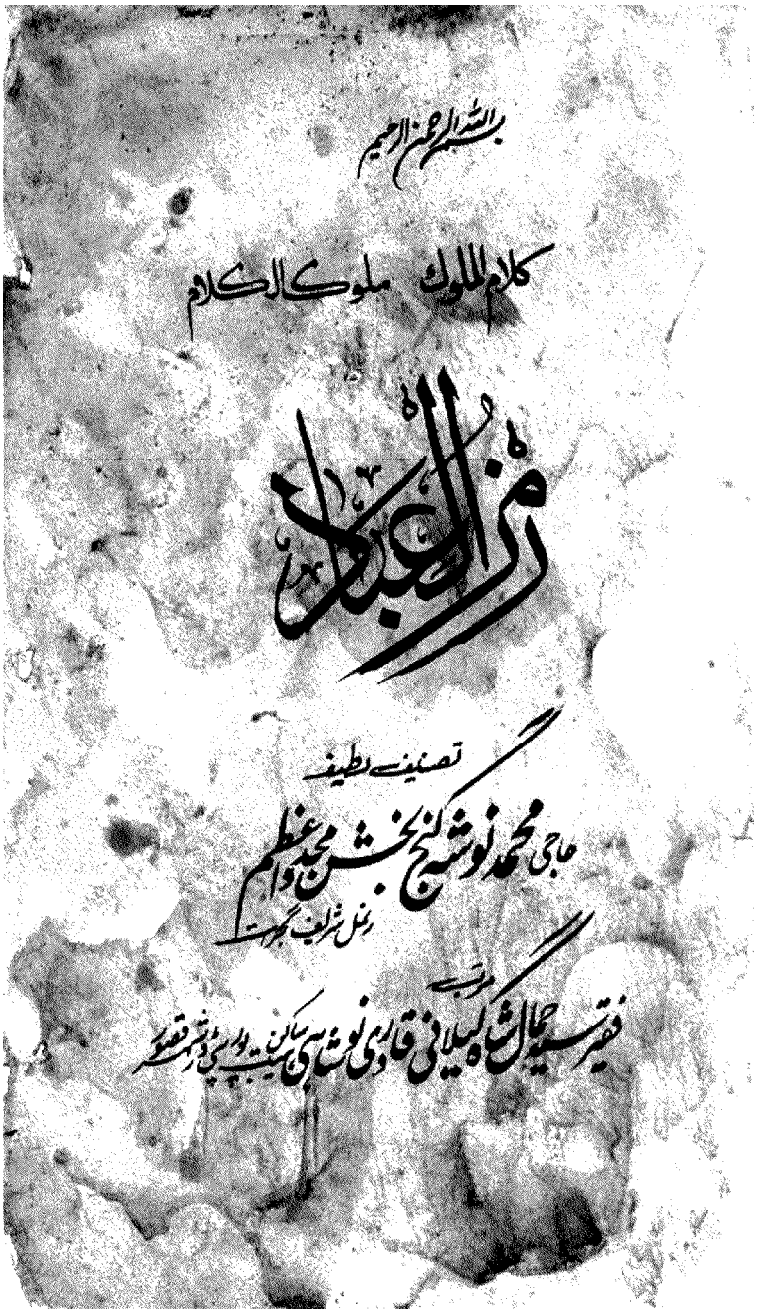

رمز العباد ورق 1 الف کا عکس

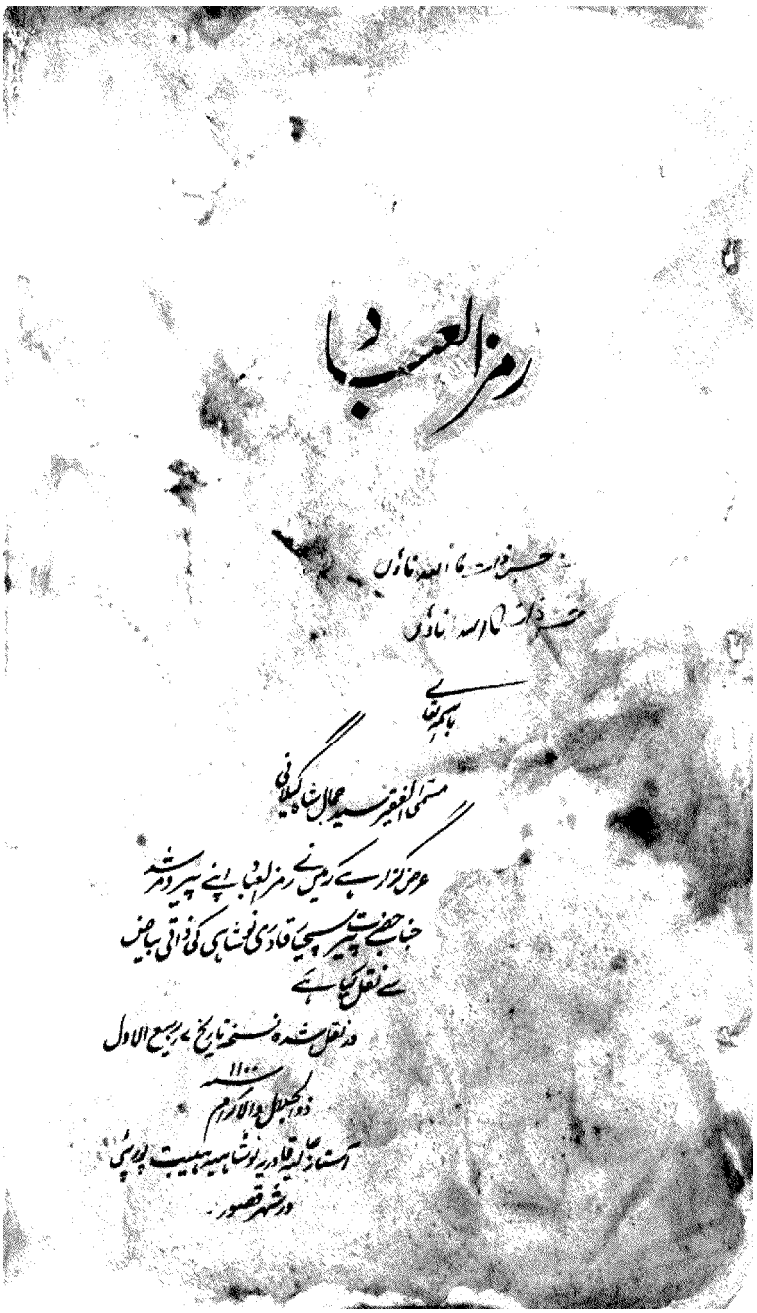

رمز العباد ورق 1 ب کا عکس

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 31, Sr.No.79, 2010, pp 47 - 80

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۱، اپریل۔جون ۲۰۱۰ء، شمارہ ۷۹

برصغیر میں فقہی ادب کی تسہیل وتفہیم
ایک تاریخی وتحلیلی جائزہ

ڈاکٹر محمد عبداللہ☆

Abstract:

The Muslims developed many learning techbniques with Islamic jurisprudence in the Sub-Continent with the rise of their culture. Four Schools of Islamic jurisprudence remained intacted likewise the rest of the regions.Elaborations of original books were written in the Sub-Continent, but the Hanfi Fiqh was launched in the very beginning. Madrasas taught this Fiqh and commentaries were put in front during teaching. The scholars of the Sub-continent guided people keeping in view the past jurisprudence learning achievements. People were kept away from jurisprudence miner issues i.e. they could not understand it. This daily needed affairs were taught in local languages but mostly in Urdu. Unfortunately here emerged some books that indulged common people in differences, it took them towards extremism. Meanwhile Shah Wali Allah (1703-1762) emerged as a moderate thinker who created an atmosphere of a balanced view. Teaching and facilitating activities remained intacted in every regions keeping in view to make them easier. Differentiating necessary and common questions and quries aloof to prepare such a literature that should be easy and comprehendible not containing the complicated terms of Islamic laws. It should be kept picked up by Urdu readers. Such activities were launched in the beginning of 20th century, still continues. This paper is going to analyse the same historical and current literature. Hoping this paper will divert the scholars attention that what kind of the method should be opted.

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں نے اپنی تہذیب کے ساتھ ساتھ جن علوم وفنون کو درجہ کمال تک پہنچایا ہے، اس میں علم فقہ بھی ہے ۔ آغاز ہی سے علم فقہ کی تدریس ، مختلف پہلوؤں پر تصنیف و تالیف اور عوام کی رہنمائی کے لیے قضاء و افتاء کا سلسلہ جاری رہا۔ برصغیر میں فقہ حنفی کو مدون کرنے اور اس سے قانونی رہنمائی حاصل کرنے کی سب سے پہلی اور عمدہ کاوش فتاویٰ عالمگیری المعروف فتاویٰ ہندیہ ہے ۔ جو اس خطہ میں لکھی جانے والی کتب فقہ وافتاء کا بنیادی مصدر کی حیثیت رکھتی ہے ۔

علماء برصغیر نے ماضی کے فقہی سرمایہ کو مدنظر رکھ کر عوام الناس کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا انہیں فقہ اور اصول فقہ کی موشگافیوں سے عملا دور رکھا۔ کیونکہ انہیں سمجھنا عوام الناس کے بس کی بات نہیں تھی۔ روزمرہ اور ضروری امور سے متعلق یہ رہنمائی مقامی زبانوں کے علاوہ عوامی زبان اردو میں زیادہ رہی۔ بدقسمتی سے بعض کتب فقہ اور فتاویٰ سے مسلکی رجحان اور انتہا پسندی نے بھی زور پکڑا ، جس سے عوام الناس کے درمیان بھی اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔تاہم ایسے علماء و مجتہدین نے اس خطہ میں جنم لیا جنہوں نے اس خلیج کو پاٹنے کی شعوری کوشش کی بالخصوص شاہ ولی اللہ دھلوی (م۱۷۶۲ء) نے الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف، میں توسع واعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''یاد رکھو کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے۔ اور ان چاروں کو بالکل نظر انداز کردینے میں بڑا مفسدہ ہے۔''(۱)

دوسری طرف آپ کے شاگرد قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اپنی تالیف مالا بدّمنه کے ذریعے تفہیم فقہ کی قابل قدر کوشش کی ۔فقہی ادب کی تسہیل وتفہیم کی کاوشیں بلاشبہ ہر خطے اور ہر دور میں نظر آتی ہیں ۔ جس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ اختلافی مسائل کا دائرہ وسیع نہ ہواور نہ اختلافات کی شدت عوام میں منتقل ہو،عمومی اور ضروری مسائل کو اختلافی حدود سے الگ تھلگ رکھتے ہوئے عقائد ، عبادات، معاشرت ومعاملات پر عام فہم اور آسان اسلوب میں ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو فقہ کی مروجہ مشکل اصطلاحات اور دقیق وپیچیدہ حاشیہ آرائیوں سے بالاتر ہو۔ چنانچہ برصغیر پاک وہند میں اردو زبان میں ایسی بہت سی کوششیں نظر آتی ہیں اور تاحال بھی جاری ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فقہ کے تسہیلی ادب کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے عصری

ضروریات کو دیکھا جائے۔اور ان کی روشنی میں کچھ تجاویز دی جائیں۔ زیرنظر مقالہ میں ذیلی عنوانات کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہوگی:

۱۔ برصغیر میں فقہی ادب کی تسہیل کا تاریخی جائزہ
۲۔ عصرحاضر میں فقہی ادب کی تسہیل کا منہج
۳۔ فقہی ادب کی تسہیل میں پیش نظر امور
۴۔ تجاویز وسفارشات

۱۔ برصغیر میں فقہی ادب کی تسہیل کا تاریخی جائزہ:

ذیل میں فقہ کی تسہیل وتفہیم کا تجزیہ کیا جاتا ہے جو قدامت کے لحاظ سے بیسویں صدی کے اوائل میں تحریر ہوئی اور زیادہ تر متحدہ ہندوستان سے شائع ہوئیں۔

۱.۱ بہشتی زیور مکمل و مدلل ازمولانا اشرف علی تھانوی:

مولانا اشرف علی تھانوی (م:۱۹۴۲ء) برصغیر پاک و ہند کے معروف عالم دین ،مفسر اور مصلح ہیں۔ جنہوں نے تصنیف و تالیف کے ذریعے بالعموم اور سلوک وتصوف کے ذریعے بالخصوص اس خطہ کے مسلمانوں کی اصلاح کی جن کو بجا طور پر حکیم الامت، کے لقب سے نوازا گیا۔ یوں تو مولانا کی بیسیوں کتب و رسائل ہیں لیکن بہشتی زیور اس لحاظ سے منفرد کتاب ہے کہ جس میں زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں دینی حوالے سے راہنمائی نہ دی گئی ہو۔ اس کا خطاب خاتون خانہ سے ہے کیونکہ معاشرتی زندگی کی یہی وہ بنیادی اکائی ہے جس پر صالح معاشرے کی تعمیر استوار ہوتی ہے۔ کتاب کے نام کی بابت لکھتے ہیں:

''.....نام اس کا بہ مناسبت مذاق نسواں، بہشتی زیور رکھا گیا کیونکہ اصل زیور یہی کمالاتِ دین ہیں چنانچہ جنت میں ان ہی کی بدولت زیور پہننے کو ملے گا **کما قال اللہ تعالی یحلون فیھا من اساور** الآیۃ''(۲)

بہشتی زیور میں طبقہ نسواں کو ہی کیوں موضوع بنایا گیا ہے اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''ایک مدت سے ہندوستان کی عورتوں کے دین کی تباہی دیکھ دیکھ کر قلب دکھتا تھا اور اس کے علاج کی فکر میں رہتا تھا اور زیادہ وجہ فکر کی یہ تھی کہ یہ تباہی صرف ان

کے دین تک محدود نہیں تھی بلکہ دین سے گزر کر ان کی دنیا تک پہنچ گئی تھی اور ان کی ذات سے گزر کر ان کے بچوں بلکہ بہت سے آثار سے ان کے شوہروں تک اثر کر گئی تھی اور جس رفتار سے یہ تباہی بڑھتی جاتی تھی اس کے اندازہ سے معلوم ہوتا تھا کہ اگر چندے اور اصلاح نہ کی جائے تو شاید یہ مرض قریب قریب لاعلاج کے ہو جائے اس لیے علاج کی فکر زیادہ ہوئی۔'' (۳)

اردو زبان میں طبقہ نسواں کے لیے کتاب کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ۔لکھتے ہیں:

''مدت دراز سے اس خیال میں تھا کہ عورتوں کو اہتمام کر کے علم دین کو اردو ہی میں کیوں نہ ہو ضرور سکھایا جائے۔ اس ضرورت سے موجودہ اردو کے رسالے اور کتابیں دیکھی گئیں تو اس ضرورت کے رفع کرنے کے لیے کافی نہیں پائی گئیں۔ بعض کتابیں تو محض نامعتبر اور غلط پائی گئیں بعض کتابیں جو معتبر تھیں ان کی عبارت ایسی سلیس نہ تھی جو عورتوں کے فہم کے لائق ہو پھر اس میں وہ مضامین بھی مخلوط تھے جن کا تعلق عورتوں سے کچھ نہیں بعض کتابیں عورتوں کے لیے پائی گئیں مگر وہ اس قدر تنگ اور کم تھیں کہ ضروری مسائل اور احکام کی تعلیم میں کافی نہیں اس لیے تجویز کی ایک کتاب خاص ان کے لیے ایسی بنائی جائے جس کی عبارت بہت ہی سلیس ہو، جمیع ضروریات دین کو حاوی ہو اور جو احکام صرف مردوں کے لیے مخصوص ہیں ان کو اس میں نہ لیا جائے اور وہ ایسی کافی ووافی ہو کہ صرف اس کا پڑھ لینا ضروریاتِ دین ،روز مرہ اور کتابوں سے مستغنی کر دے.....آخر ۱۳۲۰ھ) میں خدا کا نام لے کر شروع کر دیا۔''(۴)

بہشتی زیور کا اُسلوب

بہشتی زیور کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے مندرجہ خصوصیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ وسعت وتنوع مضامین:

مولانا نے بہشتی زیور کے ۱۱ حصوں میں انسانی زندگی میں پیش آنے والے تقریباً تمام مضامین و مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ عقائد وعبادات سے لے کر معاشرت و معاملات تک ، یہاں

تک کہ آخری دوحصوں میں صحت اور امراض سے متعلق اہم امور اور علاج تک تجویز کیے ہیں ۔ہر حصہ الگ الگ مرتب کیا گیا ہے جس میں سو کے لگ بھگ صفحات ہیں تا کہ قارئین کو پڑھنے میں سہولت رہے۔ چونکہ حصے لکھے جاتے رہے اور شائع ہوتے رہے اسی وجہ سے مضامین میں تنوع ہے اور تکرار بھی۔ ہر حصے کے آخر میں ضمیمہ بھی ہے جو بالعموم مولانا تھانوی کے حکم پر کسی اور نے لکھا ہے آخری دو جلدیں تو مولانا کے حکم پر کسی اور نے لکھی ہیں۔

۲۔ تسہیل عبارت:

مولانا نے بہشتی زیور کی تالیف میں تسہیل عبارت کو پیش نظر رکھا ہے۔متن عبارت میں ما سوائے ایک آدھ جگہ کے کوئی حوالہ نہیں ہے۔ اختلافی مسائل سے گریز کیا ہے۔ ہاں اگر ضرورت پڑی ہے تو حاشیہ میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور عام فہم ہیں ایک معمولی سا خواندہ شخص بھی عبارت کو پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔

۳۔ مدلل انداز:

مولانا نے احکام و مسائل کے بیان کرنے میں مدلل انداز اختیار کیا ہے محض سنی سنائی باتیں تحریر نہیں کیں۔ اگر ایک جملے میں کسی مسئلے کا ذکر ہے تو حاشیہ میں اس کی دلیل قرآن و حدیث یا فقہ کی عربی عبارت سے جلد وصفحہ کے استقصاء کے ساتھ درج کی ہے۔

۴۔ حنفی فقہ کا لحاظ:

برصغیر پاک وہند میں چونکہ حنفی المسلک آباد ہیں اس وجہ سے مولانا نے فقہ میں حنفی تعبیرات کو ہی اختیار کیا ہے اور وہ تمام مآخذ مثلاً شامی، عالمگیری، کنز الدقائق، نور الایضاح، ہدایہ، فتح القدیر وغیرہ کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ بہت کم مسائل ایسے ہیں جہاں دیگر فقہی تعبیرات کو اختیار کیا ہو۔

۵۔ بعض مسائل کی تدریس کا طریقہ:

مولانا کے پیش نظر طبقہ نسواں کی اصلاح ہے۔ اس لیے بعض ایسے مسائل جو عورتوں کے ساتھ خاص ہیں اور پڑھانے والا مرد ہو کا طریقہ بھی بتایا ہے مثلاً پڑھانے والا مرد ہو تو ان مسائل کو خود نہ پڑھاوے یا تو اپنی بی بی کی معرفت سمجھا دے یا ہدایت کر دے کہ بعد میں ان

مسائل کو دیکھ لینا اگر پڑھنے والا لڑکا کم عمر ہو اس کو بھی نہ پڑھائیں بلکہ صرف ہدایت کر دیں کہ بعد کو دیکھ لینا۔'(۵)

۶۔ عمومی اُسلوب:

اگرچہ فاضل مصنف نے طبقہ نسواں کو بہشتی زیور میں پیش نظر رکھا ہے تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ مردوں سے متعلق مسائل بالکل نہ ہوں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ کتاب عورتوں، بچوں اور مردوں سب کے لیے یکساں مفید ہے۔

مولانا تھانویؒ ایک عنوان قائم کرتے ہیں اس کے تحت مسائل لاتے ہیں ہر مسئلہ پر ترتیب وار نمبر دیے ہیں۔ ہر مسئلہ میں حوالہ نمبر بھی دیتے ہیں۔ حاشیہ میں وہی نمبر دے کر کتب فقہ سے عبارت نقل کرتے ہیں۔ جلد وصفحہ کا نمبر بھی دیتے ہیں۔

بہشتی زیور میں ضروریاتِ زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے اور ہر مسئلہ کو مبتدیانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ہر حصے کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل کیا گیا ہے جس میں اسی حصہ سے متعلق بعض فضائل قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ضمیمہ جات بعد میں الگ سے شامل کیے گئے ۔مولانا نے ان پر نظر ثانی حبیب احمد کیرانوی سے کرائی۔ آخری دو جلدیں جو صحت اور امراض سے متعلق وہ بھی حکیم محمد مصطفیٰ سے لکھوائی ہیں۔

بہشتی زیور کی مقبولیت:

برصغیر پاک وہند میں اردو فقہی ادب میں بہشتی زیور کو غیر معمولی قبولیت حاصل رہی۔ تقریباً ہر مسلمان گھرانے میں بہشتی زیور کا موجود رہنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ماضی قریب میں شادی بیاہ کے موقع پر قرآن حکیم کے ساتھ بہشتی زیور، کا ساتھ دینا ضروری سمجھا جاتا تھا اور اس کا گھر میں اجتماعی صورت میں مطالعہ کیا جاتا تھا۔ آج تک بغیر کسی تعطل کے اس کے ایڈیشن طبع ہو رہے ہیں۔ بعد کے دور میں جنہوں نے بھی فقہ کے تسہیلی ادب پر قلم اٹھایا وہ بہشتی زیور سے بے نیاز نہیں ہو سکا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ گھریلو انسائیکلوپیڈیا ہے تاہم آج کے دور میں اس سے استفادہ مشکل ہوتا جا رہا ہے ایک تو زبان آج کے لحاظ سے پرانی ہوگئی ہے بعض الفاظ متروک ہو گئے ہیں ۔ دوسرے ضمیمہ جات اور حاشیہ در حاشیہ میں استفادہ مشکل ہو گیا ہے۔

طباعت کے اعتبار سے بھی جدت کا تقاضا ہے کچھ اب زبان و بیان اور تسہیل کے اعتبار سے بہتر کتابیں منظر عام پر آ گئی ہیں۔(۶)

۱.۲ بہارِ شریعت ازمحمد امجد علی، اعظمی رضوی

مذکورہ کتاب دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے ۔ پہلی جلد میں نو حصے جبکہ دوسری جلد میں آٹھ حصے ہیں۔ فاضل مصنف مولانا حکیم ابو العلی محمد امجد علی اعظمی رضوی دار العلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف میں صدر مدرس رہے۔مصنف کتاب کی غرض و غایت کی بابت رقمطراز ہیں:

> ''.....اردو میں کوئی ایسی کتاب کہ سلیس، عام فہم قابل اعتماد ہو، اب تک شائع نہ ہوئی بعض میں تھوڑے مسائل کہ روز مرہ کی ضروری باتیں بھی ان میں کافی طور پر نہیں اور بعض میں اغلاط کی کثرت، لا جرم ایک ایسی کتاب کی بے حد ضرورت ہے کہ کم پڑھے اس سے فائدہ اٹھائیں لہذا فقیر یہ نظر خیر خواہی مسلمانان بقتضائے الدین النصح لکل مسلم، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس امر اہم و اعظم کی طرف متوجہ ہوا۔(۷)

فاضل مصنف نے کتاب میں جن امور کا اہتمام کیا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس کتاب میں حتی الوسع یہ کوشش ہو گی کہ عبارت بہت آسان ہو کہ سمجھنے میں دقت نہ ہو اور کم علم اور عورتیں اور بچے بھی اس سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

۲۔ اس کتاب میں مسائل کی دلیلیں نہ لکھی جائیں گی اول تو دلیلوں کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں دوسرے دلیلوں کی وجہ سے اکثر ایسی الجھن پڑ جاتی ہے کہ نفس مسئلہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔لہذا ہر مسئلے میں خالص متقع حکم بیان کر دیا جائے گا اور اگر کسی صاحب کو دلائل کا شوق ہو تو فتاویٰ رضویہ شریف کا مطالعہ کریں۔

۳۔ اس کتاب میں حتی الوسع اختلافات کا بیان نہ ہو گا کہ عوام کے سامنے جب دو مختلف باتیں پیش ہوں تو ذہن متحیر ہو گا کہ عمل کس پر کریں اور بہت خواہش کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جس میں اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اسے اختیار کر لیتے ہیں یہ سمجھ کر نہیں کہ یہی حق ہے بلکہ یہ خیال کر کے اس میں اپنا مطلب حاصل ہوتا ہے۔

اسلوب بیان:

مصنف کا اُسلوب بیانِ عبارت یہ ہے کہ عنوان قائم کر کے قرآن پاک کی ایک یا چند آیات مع ترجمہ کے اس اہمیت اور فرضیت میں لائے ہیں پھر احادیث کا عنوان دے کر متعلقہ احادیث ترتیب وار مذکورہ کی تائید وفضیلت میں لاتے ہیں۔ پھر مسائلِ فقہیہ کا عنوان قائم کر کے متعلقہ مسائل لاتے ہیں۔ حواشی پوری کتاب میں بہت ہی کم ہیں کتب فقہ کے حوالے بغیر جلد وصفحہ کی تخصیص کے متن ہی میں درج کر دیے ہیں۔

زیادہ تر جن کتب فقہ سے مصنف نے استفادہ کیا ہے ان میں درمختار، عالم گیری، فتاویٰ رضویہ، ردالمختار، صغیری، شامل ہیں۔ تاہم عربی کی بھاری بھرکم عبارات کی بجائے ترجمہ یا مفہوم پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اگرچہ مصنف نے تمہید میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ کتاب مذکورہ میں عام فہم اور سلیس انداز میں مسائل بیان کیے جائیں گے تاہم اثنائے کتب میں دقیق اور پیچیدہ مسائل بھی سامنے آتے ہیں جس سے ایک عام قاری کا کتاب سے استفادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً جلد ششم میں طلاق کے ذیل میں کنایہ کا بیان، تعلیق کا بیان، استثناء کا بیان وغیرہ۔(۸)

بہارِ شریعت کی تالیف کا مقصد محض مسلمانان برصغیر کی فقہی رہنمائی ہے یا کسی کتاب کا ردعمل اس کا ایک ہلکا سا اشارہ مولانا احمد رضا خان کی تقریظ میں ملتا ہے جو کتاب میں شامل ہے۔

> ''یہ مبارک رسالہ بہار شریعت (حصہ سوم) تصنیف لطیف ابوالعلی مولوی حکیم محمد امجد علی قادری مطالعہ کیا۔ الحمد للہ مسائل صحیحہ رجیحہ محققہ منقحہ پر مشتمل پایا۔ آج کل گمراہی واغلاط کے مصنوع وملمع زیوروں کی طرف آنکھ نہ اٹھائیں۔ مولی عزوجل مصنف کی عمر وعلم وفیض میں برکت دے اور ہر باب میں اس کتاب کے حصص کا شافی و وافی و صافی تالیف کرنے کی توفیق بخشے اور اہل سنت میں شائع ومعمول اور دنیا و آخرت میں نافع ومقبول بنائے۔(۹)

پھر کتاب کی ترتیب میں تقلیدی پہلو نظر آتا ہے مثلاً بہارِ شریعت بھی دو جلدوں میں منقسم ہے بہشتی زیور میں اگر ۱۱ حصے ہیں تو اس میں ۱۷ حصے ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں بھی ۱ حصہ تقریباً ۱۵۰ سے ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ پھر اکا دکا ایسے مسائل بھی کتاب میں نظر پڑتے ہیں

جو بعد میں بہت نمایاں ہوئے اور برصغیر میں اہل سنت والجماعت (بریلوی مسلک) کی شناخت بنے مثلاً (وہابی) یہ ایک نیا فرقہ ہے جو ۱۲۰۹ھ میں پیدا ہوا اس مذہب کا بانی محمد بن عبدالوہاب نجدی تھا جس نے تمام عرب خصوصاً حرمین شریفین میں بہت سے شدید فتنے پھیلائے علماء کوقتل کیا، صحابہ کرامؓ و آئمہ علماء کی قبریں کھود ڈالیں۔ اس نے ایک کتاب ''کتاب التوحید'' کے نام سے لکھی ہندوستان میں اسماعیل دہلوی نے اس کا ترجمہ کیا جس کا نام تقویۃ الایمان رکھا اور ہندوستان میں اس نے وہابیت پھیلائی۔ (۱۰)

ولایت کے بیان میں اولیاء کی بابت لکھا ہے:

''مسئلہ ان سے استمداد و استعانت محبوب ہے، ان کے مزارات پر حاضری مسلمان کے لیے سعادت و باعث برکت ہے۔ ان کو دور و نزدیک سے پکارنا سلف صالح کا طریقہ ہے۔'' (۱۱)

۱.۳ الحقوق والفرائض از ڈپٹی نذیر احمد:

متحدہ ہندوستان میں شمس العلماء مولوی ڈپٹی نذیر احمد(م۱۳۲۰ھ) کا شمار سماجی مصلحین میں ہوتا ہے۔ آپ اردو زبان کے معروف ادیب بھی ہیں۔ آپ نے عوامی مسائل کو عوامی زبان کے ذریعے بیان کیے۔ تاہم مذکورہ کتاب ایک دستور العمل کے انداز میں مرتب کی گئی ہے چنانچہ کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا نام تو فرائض انسانی ہے مگر فرض سمجھ کر دیکھو تو اور حقوق سمجھ کر دیکھو تو بات ایک ہی ہے۔ غرض زندگی کا دستور العمل ہے۔ جامع کہ جیسے جیسے معاملات آدمی کو دنیا میں پیش آتے ہیں سب کے بارے میں حکم و ہدایت اس دستور العمل میں موجود ہے چاہیے کہ ہر مسلمان جو اسلام کا دم بھرتا ہے اور اُردو پڑھ سمجھ سکتا ہے اسی دستور العمل کا ایک نسخہ اس کے پاس ہو۔'' (۱۲)

کتاب میں مندرجہ ذیل عنوانات کے ساتھ مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ اعمال قلبی ۲۔ اعمال انسانی

۳۔ اعمال بدنی ۴۔ اعمال مالی

مذکورہ چاروں حصوں میں سے اعمال بدنی کا تعلق براہ راست فقہی ادب سے ہے

جسے ڈپٹی نذیر احمد نے نقشوں کی مدد سے واضح کیا ہے۔ مثلاً نقشہ نجاست حقیقی داخلی، نقشہ نجاست حقیقی خارجی، نقشہ نجاست حکمی داخلی، نقشہ نجاست حکمی خارجی، نقشہ مکروہات وفصل، نقشہ مکروہاتِ خارجی وغیرہ (۱۳)

کتاب میں مباحث کا اُسلوب یہ ہے کہ عنوان کو قائم کر کے ،متعلقہ آیات مع ترجمہ کے، اگر متعلقہ حدیث ہو تو وہ بھی ترجمہ کے ساتھ پھر من المترجم کا عنوان قائم کر کے متعلقہ مسائل کی آسان انداز میں توضیح کی ہے۔ مسائل زیادہ تر احادیث سے اخذ کیے گئے۔ کتاب کی زبان قدیم ہے اگرچہ اسلامک پبلی کیشنز نے اس کی تسہیل کرنے کی کوشش کی ہے مگر اب بھی اس کتاب سے استفادہ دشوار ہے اس لیے کہ بہتر کتابیں بہتر اُسلوب کے ساتھ دستیاب ہیں تاہم اس دور کے لیے اسلامی تعلیمات کا جامع مختصر اور مستند ذخیرہ تھا۔

۱.۴ تعلیم الاسلام از مفتی کفایت اللہ دھلوی:

مفتی کفایت اللہ دھلوی (م۱۳۷۲ھ) مدرسہ امینیہ دھلی میں صدر مدرس رہے۔ مذکورہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے ۔ بنیادی طور پر یہ رسالے 'مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم' کے لیے تیار کیے گئے ہیں تاہم عوام الناس بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

کتاب میں سوال و جواب کا انداز اپنایا گیا ہے۔ سوال کا انداز آسان سے مشکل کی طرف اور نامعلوم سے معلوم کی طرف ہے۔ بالعموم سوالات واضح اور مختصر ہیں اسی طرح جوابات بھی مختصر ہیں۔ مثلاً سوال، مسح کرنے کے کیا معنی ہیں؟ جواب، ہاتھ کو پانی سے بھگو کر کسی عضو پر پھیرنے کو مسح کہتے ہیں۔ (۱۴)

کتاب کا اُسلوب سادہ، عام فہم اور زبان سہل اور سلیس ہے، بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھا گیا ہے کتاب میں حنفی فقہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے تاہم پوری کتاب میں کسی بھی فقہ کی کتاب یا فقہی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا۔ کتاب کا ہر حصہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا شعبہ تعلیم الایمان یا اسلامی عقائد کا دوسرا شعبہ تعلیم الارکان یا اسلامی اعمال کا ہے۔ کتاب کی ان خصوصیات کی بنا پر درس نظامی کے ابتدائی درجوں میں کتاب شاملِ نصاب ہے۔

۱.۵ علم الفقہ چھے حصے کامل اردو از مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی

کتاب کے سرورق پر کتاب کا تعارف یوں کرایا گیا ہے:

''علم الفقہ اردو زبان میں مکمل فقہ اسلامی کی ایک بہترین کتاب ہے جس میں وہ تمام اسلامی احکام ومسائل کہ جن کی ہر مسلمان کو دن رات ضرورت پیش آتی ہے درج ہیں۔ اس کتاب میں عربی کی ضخیم اور مستند کتابوں کے تمام مضامین سہل اور آسان اُردو میں منتقل کر دیے گئے ہیں تاکہ ہر مسلمان خود مسائل دیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو سکے۔ اس لیے ہر مسلمان گھرانے میں اس کی موجودگی نہایت ضروری ہے۔'' (۱۵)

مصنفؒ نے کتاب میں جن امور کا لحاظ رکھا ہے اس کی صراحت یوں کرتے ہیں:

۱۔ ہر شے کے متعلق جس قدر احکام ہیں وہ سب ایک جگہ جمع کر دیے جاویں تاکہ ہر شخص کو مسئلہ نکالنے میں آسانی ہو۔

۲۔ ہر مسئلہ میں وہی قول لکھا جائے گا جس پر فتویٰ ہے مختلف اقوال اور روایات کا ذکر نہ کیا جائے گا تاکہ دیکھنے والے کے ذہن کو انتشار نہ ہو۔

۳۔ وہ بہت سے مسائل جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہیں حالانکہ ان کے نہیں یا بعض کمزور مسائل کو مفتی بہ لکھ دیا گیا ہے اس کی بھی تحقیق کی جائے گی۔

۴۔ بعض مسائل کی بلحاظ ضرورت دلیل بھی بیان کی جائے گی۔

۵۔ زمانہ کے بدلنے سے جو احکام بدل گئے ہیں اور تجارت کے لیے اسباب مثل ریل، تار، ڈاک کی ٹکٹ، اسٹامپ نوٹ وغیرہ کے احکام کا بھی بیان ہوگا۔

۶۔ جب کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے کہ جس کا حکم کتب فقہ میں نہیں یا سخت اختلاف کی وجہ سے ایک یا دو شخص فیصلہ نہ کر سکیں تو علمائے عرب وعجم سے مشورہ کر کے محقق قول لکھ دیا جائے گا۔

۷۔ جن کتب معتبرہ سے مسائل نقل کیے جائیں گے ان کے نام بحوالہ صفحہ وسطر یا فصل و باب لکھ دیے جائیں گے تاکہ اگر کسی کو اصل کا دیکھنا منظور ہو تو اس کو دقت نہ ہو ہاں جن مسائل میں اتفاق ہے یا یقین ہے ان کا حوالہ نہ دیا جائے گا۔

۸۔ اردو عام فہم ہوگی لغت اور اصطلاح کی بھرت نہ ہوگی تاکہ عام لوگ بھی سمجھ لیں۔

میں خداوند تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کر کے پوری امید رکھتا ہوں کہ میری اس کتاب سے عام اہل اسلام کو نفع ہوگا علم والوں کو بھی اور بے علموں کو بھی، عورتوں کو بھی، مردوں کو بھی اس لیے اس کی عبارت اس قدر آسان ہے جس کا سمجھنا کسی جاہل کو مشکل نہیں۔ (۱۶)

مذکورہ کتاب ایک ہی جلد میں چھ حصوں میں منقسم ہے حصوں میں مضامین کی تقسیم کچھ یوں ہے:

حصہ اول: مسائل طہارت	حصہ دوم: مسائل نماز
حصہ سوم: مسائل رمضان	حصہ چہارم: مسائل زکوٰۃ وصدقات
حصہ پنجم: مسائل حج	حصہ ششم: مسائل معاشرت

مفتی محمد شفیعؒ نے کتاب کی تقریظ میں لکھا ہے:

''مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کی تصنیف ،لطیف علم الفقہ اردو زبان میں مکمل فقہ اسلامی کی بہترین کتاب ہے اس کے مستند اور معتبر ہونے کے لیے تو خود حضرت مصنف کا اسم گرامی کا نام ضمانت ہے جو اپنے علم وفضل اور خدمات کی بنا پر محتاجِ تعارف نہیں۔ کتاب کی ترتیب سہل اور عام لوگوں کے فائدہ کے لیے عبارت آسان کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے تاکہ عام اردو خواں حضرات بآسانی اس سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ (۱۷)

کتاب کا بغور مطالعہ کرنے سے مندرجہ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:

۱۔ کتاب میں بڑی حد تک جامعیت ہے ۔مسائل کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۲۔ اہم اصطلاحات کی تصریح کر دی گئی ہے جیسے حج کے ضمن میں اصطلاحی الفاظ اور مقامات کے ناموں کی تشریح

۳۔ بعض مقامات پر اصول وکلیات بھی مثالوں کے ساتھ بیان کیے گئے جس سے تفہیم مسائل میں آسانی ہوتی ہے۔

۴۔ ہر حصے کے آغاز میں قرآنِ حکیم کی آیات اور احادیث مبارکہ عربی متن اور ترجمہ کے ساتھ دی گئی ہیں ان کا نام کہیں تو چہل آیات، چہل احادیث یا چہل آثار(اگر کسی صحابی کے ہیں) کا نام دیا گیا ہے۔

۵۔ حواشی مختصر اور ضروری مسائل پر ہی ہیں۔ کتب حوالہ اختصار کے ساتھ متن میں ہی دے دی گئی ہیں۔

۶۔ کتاب میں جن مآخذ سے استدلال کیا گیا ہے ان میں صحاح ستہ کے علاوہ الدرالمختار، البحر الرائق، شامی، فتح القدیر، احیاء العلوم، الاشباہ والنظائر، فتح القدیر، طحطاوی،

کنزالعمال اور مراقی الفلاح شامل ہیں۔

۷۔ مرکزی اور ذیلی عنوانات کے تحت مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

مذکورہ کتاب فقہ حنفی کے رجحان کی حامل ہے۔ ابتداً یہ کتاب ہندوستان سے چھپی۔ رضی عثمانی نے مولانا مفتی محمد شفیع کے مشورے سے پاکستان میں چھپوانے کا اہتمام فرمایا۔ کتاب اپنے اُسلوب کے اعتبار سے عام فہم اور زبان سلیس ہے خاص طور پر ترتیب کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ البتہ بعض مقامات پر غیر معروف کتابوں کے حوالے سے بھی مسائل بیان کیے گئے ہیں تاہم آج کے دور کے مطابق بہتر استفادہ کے لیے کتاب کی طباعت کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

۱.۶ فقہ السنۃ از محمد عاصم الحداد:

مذکورہ کتاب ایک ہی جلد میں دوحصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب الجنائز جبکہ حصہ دوم میں کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصیام اور کتاب الحج والعمرۃ شامل ہیں۔

مصنف کتاب کی تالیف کی غرض و غایت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''ایک عرصہ سے دل میں یہ تمنا تھی کہ قرآن و حدیث کے ان احکام کا مطالعہ کیا جائے جن کا تعلق انسان کے عقائد سے زیادہ اعمال سے ہے۔ اور جن کے مجموعہ کو اصطلاح میں فقہی احکام کہا جاتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ہر مسئلہ میں صحابہؓ اور آئمہ سلف کا مسلک اور اس کی دلیل معلوم کی جائے۔ بارہا حدیث کی شرحوں کا الگ الگ مطالعہ کیا لیکن ذوق کو تسکین نہ ہوئی۔ بالآخر آج (۱۹ اکتوبر ۱۹۵۸ء) سے تقریباً تین سال پیشتر جب ادارۂ چراغِ راہ نے مجھ سے اپنے اس ارادہ کا تذکرہ کیا کہ وہ فقہ کی ایک مختصر کتاب مرتب کرا کے شائع کرانا چاہتے ہیں تو میں نے اسے اپنی دلی تمنا کو بروئے کار لانے کا ایک موقع تصور کیا اور ذہنی نقشے کے مطابق کام شروع کر دیا چنانچہ آج اپنی زیر ترتیب کتاب فقہ السنہ کا پہلا حصہ ملک کے اردو دان طبقہ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔''(۱۸)

کتاب کی ترتیب و اُسلوب:

فاضل مصنف نے مذکورہ کتاب کی ترتیب میں جن پہلوؤں کا لحاظ رکھا ہے اس کو ان

نکات کے تحت واضح کیا ہے:

۱۔ متن میں وہ مسائل دیے گئے ہیں جن پر حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ اور جمہور اہل حدیث کا اتفاق ہے۔ یا پھر کم از کم ان مذاہبِ خمسہ کی اکثریت کا ان پر اتفاق ہے۔

۲۔ جن مسائل میں حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ اور اہل حدیث علماء کا مسلک الگ الگ ہے ان کا ذکر متن میں نوٹ دے کر حاشیہ میں کیا گیا ہے۔

۳۔ جن مسائل کے متعلق مذکورہ بالا پانچ مذاہب میں سے کسی کے نزدیک کوئی ایسی تفصیل ہے تو اس کا ذکر فائدہ کے عنوان کے تحت متن ہی میں ذکر کر دیا گیا ہے اور بعض مواقع پر اس کا ذکر حاشیہ میں کیا گیا ہے۔

۴۔ ہر مسئلہ میں ہر مسلک کے متعلق یہ کوشش کی گئی ہے کہ نہ صرف یہ قرآن و حدیث سے اس کی بنیاد کا ذکر کیا جائے بلکہ یہ بھی بتایا جائے کہ اگر دوسرے مسلک والوں کی بنیاد کس دوسری آیت یا حدیث پر ہے تو یہ اختلاف کیوں ہے۔

۵۔ جن مسائل کی بنیاد براہ راست کسی نص پر نہیں بلکہ اجتہاد پر ہے۔ ان مسائل کا ذکر بھی متن میں نوٹ دے کر حاشیہ میں کیا گیا ہے۔ (۱۹)

فاضل مصنف نے تمام مسالک کے دلائل نقل کرنے کا جواب یوں دیا ہے:

> ''ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کے موجودہ مسلکوں سے ہٹا کر انہیں کسی خاص مسلک کی طرف دعوت دی جائے بلکہ اس سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے خواہ وہ کسی مسلک سے تعلق رکھنے والے ہوں جہاں اپنا مسلک اور اس کا ماخذ معلوم کریں وہاں انہیں دوسرے مسالک اور ان کے مآخذ کا بھی علم ہوتا کہ اس طرح دلوں میں فراخی اور رواداری پیدا ہو۔(۲۰)

اگرچہ فقہ السنہ کے نام سے سید سابق کی کتاب بھی عربی میں موجود ہے۔ مگر فاضل مصنف نے اس امر کی تردید کی ہے کہ یہ اس کا ترجمہ ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''کتاب کے نام سے بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ مصر کے مشہور عالم دین سید سابق کی کتاب 'فقہ السنہ'' کا اردو ترجمہ ہے حالانکہ نام کی یکسانیت کے باوجود دونوں کے موضوع میں فرق ہے۔'' (۲۱)

کتاب کے بارے میں ایک عمومی تاثر قارئین کو یہ بھی دیا ہے:

''اس کتاب کے شائع کرتے وقت ہم یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ کتاب کوئی فتویٰ کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس میں ہر مسلک کے تمام دلائل اور جزئیات کو پوری تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ اس قسم کی مختصر کتاب میں تمام دلائل اور جزئیات کا پوری تفصیل سے ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا..... اس کتاب کے پڑھنے والوں سے ہماری یہ بھی گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کو مختلف مسالک کے درمیان محاکمہ کا ذریعہ نہ بنائیں۔'' (۲۲)

فاضل مصنف نے مسائل کو بیان کرنے کا طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ پہلے عنوان قائم کرتے ہیں پھر اس کا حکم بتاتے ہیں۔ جو بالعموم احادیث سے ماخوذ ہوتا ہے۔ کتب حدیث اور بعض کتب فقہ کے حوالے متن ہی میں درج کر دیتے ہیں۔ قدرے تفصیل حاشیہ میں دیتے ہیں جلد وصفحہ کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ زیادہ تر تفصیلات نیل الاوطار، الفقہ علی المذاہب الاربعہ، الفتح الربانی سے ہی ماخوذ ہیں۔ جدید مسائل سے زیادہ اعتناء نہیں کرتے کسی خاص فقہ کو ترجیح بھی نہیں دیتے۔ البتہ کہیں کہیں حواشی میں تفصیلات زیادہ ہیں جس کی عوام الناس کو چنداں ضرورت نہ ہے تاہم مجموعی لحاظ سے فقہی احکام کا عمدہ مجموعہ ہے۔

۱.۷ آسان فقہ ازمولانا محمد یوسف اصلاحی :

اگرچہ فاضل منصف نے آسان فقہ کی تین جلدیں (حصے) پیش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ مگر دو ہی جلدیں منصۂ شہود پر آسکیں۔ تیسری جلد جو معاشرت و معاملات پر مشتمل ہونا تھی منظر عام پر نہ آسکی تاہم مطبوعہ جلدوں میں پہلی جلد یا حصہ کتاب العقائد، کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ پر مشتمل ہے جبکہ دوسری جلد زکوٰۃ، صوم اور حج کے احکام پر مشتمل ہے۔ (۲۳) مصنف نے کتاب کی ضرورت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''عرصے سے ایک ایسے مختصر فقہی مجموعے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو عام فہم اُسلوب، آسان زبان اور جدید تصنیفی انداز میں ترتیب دیا گیا ہو تاکہ آسانی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق وہ شرعی احکام و مسائل معلوم کیے جاسکیں جن کی عملی زندگی میں عام طور پر مسلمان کو ضرورت پڑتی ہے۔'' (۲۴)

کتاب کے عمومی اُسلوب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''برصغیر میں اگرچہ ہر مسلک کے پیرو موجود ہیں لیکن ان کی عظیم اکثریت حنفی مسلک ماننے والوں کی ہے۔ آسان فقہ خاص طور پر انہی کے لیے مرتب کی گئی ہے اس میں اختلافات سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف وہی متفقہ عملی مسائل بیان کیے گئے ہیں جن پر احناف کا عمل ہے اور جو عام طور پر پیش آتے ہیں تاکہ عام مسلمان ذہنی خلفشار سے محفوظ رہتے ہوئے یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ اپنے مسلک کے مطابق عمل کرسکیں۔'' (۲۵)

فاضل مصنف نے کتاب کے تعارف میں علم فقہ کی مشکلات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہر عالم اس موضوع پر نہ قلم اُٹھا سکتا ہے اور نہ ہی مجتہدانہ گفتگو کرسکتا ہے اور زیرنظر کاوش بھی کوئی تحقیقی اور مجتہدانہ نہیں ہے بلکہ عوام الناس کی ہدایت و رہنمائی کی ایک کاوش ہے۔ امت میں ایسے گروہ کا وجود ناگزیر ہے جو مسلمانوں کی فقہ کے میدان میں راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں۔

بالعموم فقہ کی کتابوں کا آغاز کتاب الطہارۃ سے کیا جاتا ہے لیکن مولانا یوسف اصلاحی نے کتاب العقائد کو پہلے رکھا ہے اور اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ ''مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامی عقائد و افکار سے پوری طرح واقف ہو تاکہ ان پر شعوری ایمان لاکر اپنی زندگی کو سنوارنے اور سدھارنے کے لیے ان کو بنیاد بنائے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ غیر اسلامی عقائد و خیالات سے بخوبی واقف ہو جو ایمان و اسلام کے خلاف ہیں۔ (۲۶)

کتاب کا عمومی اُسلوب وخصوصیات:

کتاب کا بغور جائزہ لینے کے بعد مندرجہ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:

۱۔ مصنف نے مشکل فقہی اصطلاحات کی تشریح و توضیح کے لیے کتاب کے آغاز ہی میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ان کی فہرست مرتب کر دی ہے تاکہ ان کو یکجا دیکھا اور سمجھا جا سکے اور ہر مقام پر ان اصطلاحات کی تشریح کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

۲۔ مصنف بالعموم کسی بھی موضوع پر لکھنے سے پہلے اس کی اہمیت قرآن و حدیث سے واضح کرتے ہیں تاکہ اس کی اہمیت قاری کے دل میں خوب بیٹھ جائے۔

۳۔ بعدازاں ایک عنوان قائم کر کے بڑے دل نشین، عام فہم انداز میں نکات وار اس کی

تشریح وتوضیح کرتے ہیں اگر کہیں ضرورت محسوس ہوتو حاشیہ میں کسی بات کی مختصر وضاحت بھی کر دیتے ہیں۔

۴۔ متن عبارت میں کہیں بھی فقہی کتب سے بھاری بھرکم عبارات نقل نہیں کرتے نہ ہی حوالہ دیتے ہیں ہاں اگر ضرورت سمجھیں تو آیات یا احادیث کا متن یا ترجمہ نقل کر دیتے ہیں وگرنہ ترجمہ ومفہوم اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔

۵۔ اختلافی مسائل کی صورت میں کہیں کہیں حاشیہ میں مختصر توضیح کردیتے ہیں مثلاً وتر کے وجوب کی بابت لکھتے ہیں ''جو شخص وتر نہ پڑھے اس کا ہماری جماعت سے کوئی تعلق نہیں (ابو داؤد، حاکم) اسی تاکید کے پیش نظر امام ابو حنیفہؒ اس کو واجب کہتے ہیں البتہ اہل حدیث، امام شافعی اور قاضی ابو یوسف کے نزدیک وتر کی نماز سنت ہے۔ (۲۷)

۶۔ بعض مقامات پر کتبِ فقہ کے حوالہ سے مختصر توضیح بھی کر دیتے ہیں یہ توضیح تجزیاتی نوعیت کی ہوتی ہے۔

۷۔ کتاب کی اہم خوبی اس کی جامعیت ہے مولانا اصلاحی جس بھی عنوان کو لیتے ہیں اس کے تمام پہلوؤں پر قابل قدر روشنی ڈالتے ہیں۔

۸۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے مآخذ کی فہرست بھی دے دی ہے ساتھ یہ عبارت بھی لکھ دی گئی ہے احکام کی حکمت وفضیلت کے مباحث میں ان کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے (چودہ کتب کی فہرست) اور مسائل واحکام کسی اجتہادی کاوش اور محاکمے کے بغیر سادہ انداز میں ذیل کی کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں اور صرف وہی متفق علیہ مسائل منتخب کیے گئے ہیں جن کی عام طور پر ضرورت پیش آتی ہے۔ ان مآخذ میں الہدایہ، قدوری، نور الایضاح، علم الفقہ، تعلیم الاسلام، بہشتی زیور، فتاویٰ دار العلوم دیو بند اور رسائل ومسائل وغیرہ شامل ہیں۔

ان خصوصیات کے پیش نظر مذکورہ کتاب کو عوام الناس میں غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اور اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱.۸ اسلامی فقہ از مولانا مجیب اللہ ندوی:

مولانا مجیب اللہ ندوی دار المصنفین (اعظم گڑھ، انڈیا) کے رفیق رہے۔ مصنف کے قلم سے متعدد کتابیں نکلیں ہیں۔ مولانا نے اس دعویٰ کے ساتھ کتاب کو پیش فرمایا ہے کہ ہر

مسلمان گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے جس میں اسلامی شریعت کا کوئی گوشہ چھوٹا نہیں۔ تقریباً دو ہزار سے زائد مسائل کے شرعی جوابات۔'' (۲۸)

مذکورہ کتاب کے دو حصے ہیں پہلا حصہ عقائد و عبادات پر ،جب کہ دوسرا حصہ معاملات و معاشرت پر مشتمل ہے۔مصنف نے کتاب کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''اسلامی فقہ پر اردو زبان میں متعدد مختصر و مطول کتابیں موجود ہیں ان کتابوں کے ہوتے ہوئے بھی راقم نے اپنی کم سوادی اور علمی بے مائیگی کے باوجود ایک اور کتاب لکھنے کی جرأت کی ہے۔ اس کی ضرورت تھی یا نہیں اس کا فیصلہ اہل علم اور ناظرین کتاب پر چھوڑتا ہوں مگر اس پر رائے اسی وقت قائم کی جائے تو بہتر ہے جب کتاب کے تمام حصے مطالعے کر لیے جائیں۔''(۲۹)

کتاب کی نمایاں خصوصیات:

فاضل مصنف نے کتاب کے اسلوب اور نمایاں خصوصیات پر یوں روشنی ڈالی ہے۔:

۱۔ ہندوستان و پاکستان کے مسلمان زیادہ تر حنفی المسلک ہیں اس لیے یہ کتاب اصلاً اسی مسلک کے مطابق لکھی گئی ہے۔

۲۔ ہر بیان کے ابتداء میں ایک تمہید لکھ دی گئی ہے جس میں قرآن و سنت کی روشنی میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اس باب میں جو مسائل بیان ہوں گے وہ کتاب و سنت کے ان ہی اصولی احکام کی تشریح و تفصیل ہوں گے تا کہ پڑھنے والے کو مآخذ و ماخوذ اور اصل و فروع میں باہم تعلق محسوس ہو اور یہ فروعی و جزوی مسائل ایجادِ بندہ معلوم نہ ہوں۔

۳۔ کتاب کی زبان زیادہ سے زیادہ آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی اس کو آسانی سے سمجھ سکیں اور مثالیں عمومی وہی دی گئی ہیں جن سے روز مرہ سابقہ رہتا ہے۔

۴۔ زیادہ تر کثیر الوقوع مسائل کا ذکر کیا گیا ہے اور نادر الوقوع مسائل کا ذکر نہیں کیا گیا۔

۵۔ جس بیان میں کثرت سے اصطلاحی الفاظ آئے ہیں ان کی فہرست اس بیان کے شروع میں دے دی گئی ہے اور جہاں جہاں ان کا ذکر آیا ہے ان کا ترجمہ کر دیا گیا ہے یا ان کے مرادف الفاظ لکھ دیے گئے ہیں تا کہ وہ اصطلاحیں بھی ذہن نشین ہو جائیں او رمختصر الفاظ

میں اصولی مسائل کا تذکرہ بھی ہو جائے خاص طور پر طلبہ کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔

۶۔ کتاب میں جتنے مشکل عربی اور اصطلاحی الفاظ آئے ہیں ان پر اعراب یعنی زیر، زبر، پیش وغیرہ دے دیے گئے ہیں ۔ اور ان الفاظ کی معنوی و اصطلاحی تفسیر کے ساتھ لغوی تشریح بھی کر دی گئی ہے تا کہ الفاظ کے تلفظ میں دقت نہ ہو۔

۷۔ افادیت کے خیال سے بعض ابواب کی ترتیب بھی راقم نے فقہ کی عام کتابوں کے خلاف رکھی ہے۔

۸۔ کتاب میں بعض جدید مسائل مثلاً رویت ہلال میں ریڈیو اور تار کی خبر کی شہادت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں مصنف نے دیباچہ میں اپنے مآخذ و مصادر کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ان میں قرآن مجید کے علاوہ حدیث و فقہ کی معروف کتب جیسے صحاح ستہ، مشکوٰۃ ،مؤطا، قدوری، ہدایہ، بدائع الصنائع ،نور الایضاح، کتاب الام، اردو میں الحقوق والفرائض، بہشتی زیور اور علم الفقہ شامل ہیں۔

فاضل مصنف کا اُسلوب یہ ہے کہ پہلے ایک مرکزی عنوان قائم کرتے ہیں۔ اس کا عام فہم مفہوم بیان کرتے ہیں۔ پھر قرآن و سنت سے دلائل دیتے ہیں۔ ذیلی عنوانات کے ساتھ مسائل کی تفصیل دیتے ہیں۔ مثلاً تیمّم کا بیان، تیمّم کے معنی، تیمّم کے فرائض، تیمّم کا مسنون طریقہ، کن چیزوں سے تیمّم جائز ہ کن نجاستوں سے تیمّم ناجائز ہے۔ ضروری ہدایات، تیمّم کب کرنا چاہیے؟ کن باتوں سے تیمّم ٹوٹ جاتا ہے وغیرہ۔ (۳۰)

فاضل مصنف نے فقہ کی منتخب اور متداول کتب کی عبارت کے بعض متن حاشیہ میں نقل کیے ہیں۔ علاوہ ازیں جدید مسائل سے بھی اعتناء کیا ہے جیسے ریل، ہوائی جہاز اور پانی میں قبلہ کا تعین اختلاف مطالع کی بحث وغیرہ۔ دیگر مآخذ کے ساتھ ساتھ مصنف نے شیخ عبدالرحمٰن الجزری کی کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ سے بھی خوب استدلال کیا ہے۔

عبادات کے ضمن میں اگر ایک سے زیادہ اذکار و ادعیہ ماثورہ ہیں تو ان سب کو درج کر دیا ہے۔ عبارات جو بھی نقل کی ہیں جلد اور صفحہ کے استقصاء کے ساتھ کی ہیں۔

۱.۹ اسلامی فقہ کا انسائیکلوپیڈیا از مولانا منہاج الدین مینائی :

زیر نظر کتاب کے مؤلف مولانا منہاج الدین مینائی ہندوستانی عالم ہیں۔ ابتداً کتاب

کی اشاعت بھی ہندوستان میں ہوئی کتاب کا تعارف کرواتے ہوئے محمد فاروق خان لکھتے ہیں:

''عربی زبان میں فقہ کی متعدد کتابیں موجود ہیں ضرورت تھی کہ عام ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے آسان اردو زبان میں فقہ کی کوئی ایسی کتاب ترتیب دی جائے جس سے عام مسلمان بآسانی استفادہ کرسکیں۔ مولانا منہاج الدین مینائی صاحب نے کوشش کی ہے کہ تمام ضروری اور عملی مسائل اس میں آ جائیں۔ چنانچہ کم وبیش دو ہزار مسائل پر کتاب مشتمل ہے کتاب کی ترتیب کے وقت مؤلف کے سامنے فقہ کی بیشتر مستند کتابیں رہی ہیں جس کتاب سے خاص طور پر انہوں نے استفادہ کیا ہے وہ علامہ الجزیری کی کتاب 'کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ' چونکہ یہاں کی اکثریت فقہ حنفی کی پیرو ہے اس لیے انہوں نے اپنی کتب میں متفق علیہ مسائل میں صرف حنفی فقہاء کے مسلک کو اختیار کیا ہے اور جہاں آئمہ کی رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے وہاں دوسری رائے بھی نقل کر دی ہے اس طرح اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔'' (۳۱)

فاضل مصنف نے دیباچہ میں کتاب کی غرض و غایت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے لکھتے ہیں:

''اردو زبان میں اسلامی فقہ پر کتابیں موجود ہیں اور اہل علم حضرات نے حسب توفیق اس علم کو پھیلانے کی کوششیں کی ہیں موجودہ صدی میں (چوہویں صدی عیسوی) میں مصر کے نامور فقیہہ عبدالرحمٰن الحریری کی الفقہ علی المذاہب الاربعہ کامیاب کوشش ہے ہم نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے لیکن چاروں آئمہ کے مسالک علیحدہ علیحدہ بیان کرنے کی بجائے حنفی مسلک کو بنیاد بنایا ہے کیونکہ برصغیر کے مسلمان زیادہ تر حنفی مسلک پر ہیں۔ (۳۲)

کتاب کا عمومی اُسلوب:

فاضل مؤلف ایک عنوان قائم کرتے ہیں پھر اس کے ذیل میں نکات وار مسائل بیان کرتے ہیں مثلاً آذان کا بیان، ذیلی عنوانات آذان کی تعریف، آذان کا حکم اور اس کی مشروعیت، آزان دینے کا طریقہ اور اس کے الفاظ آذان کی سنتیں اور مستحبات ،آذان میں کیا باتیں مکروہ ہیں۔ (۳۳)

اگر کتاب میں قرآن حکیم کی آیت سے استدلال کیا ہے تو اس کا حوالہ دیا گیا ہے احادیث کی صورت میں کتاب حدیث یا راوی کا نام لکھ دینا ہی کافی سمجھا گیا ہے اختلافی مسائل میں اول تو بحث ہی نہیں کی گئی۔ اگر کی بھی گئی ہے تو فقہ حنفی کی تعبیرات کو اختیار کیا گیا ہے تاہم جدید اور پیچیدہ مسائل سے بھی احتراز کیا گیا ہے۔

اسلامی فقہ کے مصنف مولانا مجیب اللہ ندوی نے 'اسلامی فقہ کا انسائیکلوپیڈیا' کو سرقہ قرار دیا ہے لکھتے ہیں:

> ''کتاب کے نام اور اس کے مضامین اور عنوانات کا جس دلیری کے ساتھ سرقہ کیا گیا ہے اس کو چھپانے کے لیے دیباچہ میں کہا گیا ہے کہ اس میں عبدالرحمٰن الجزری کی کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے حالانکہ اس کتاب کے ایک صفحہ میں بھی فائدہ نہیں اُٹھایا گیا اور اس کو سمجھنے کی صلاحیت نہ تو مؤلف میں ہے اور نہ ناشر کے اندر ہے۔ جو انصاف پسند دونوں کتابوں کا مطالعہ کرے گا اس پر فریب ظاہر ہو جائے گا۔ (۳۴)

مذکورہ اقتباس کے پیش نظر مولانا مجیب اللہ ندویؒ کے دعویٰ میں کس قدر صداقت موجود ہے؟ البتہ کتاب میں بعض عنوانات اسلامی فقہ سے بعینہ ماخوذ ہیں ۔ اگر اسلامی فقہ کا انسائیکلوپیڈیا اس کتاب سے استفادہ کا اعتراف کر لیتے اور کتب مذکورہ کا حوالہ دیتے تو چنداں غلط بات نہ تھی نہ ہی ان پر سرقہ کا غیر اخلاقی الزام عائد ہوتا تاہم ہندوستان و پاکستان میں یہ وبا عام ہے کہ کتابیں بغیر اجازت کے طبع ہو جاتی ہیں بعض اوقات نام بھی بدل دیا جاتا ہے۔ تاہم سہیل، اختصار اور طباعت کے جدید تقاضوں کے پیش اسلامی فقہ کا انسائیکلوپیڈیا عوام الناس کے لیے نہایت مفید ہے۔

۱.۱۰ تسہیل الضروری لمسائل القدوری ازمفتی عاشق الٰہی بلندشہری:

(اردو ترجمہ: بنیادی فقہی احکام ازمولانا عبدالغنی طارق)

مفتی عاشق الٰہی بلندشہری معروف ہندوستانی عالم اور فقیہہ ہیں جنہوں نے مدینہ منورہ میں زندگی کے آخری برسوں میں جامعہ میں تدریس کی وہیں مدفون ہوئے۔ انہوں نے دینی موضوعات پر متعدد تصانیف قلم بند کیں۔ مذکورہ کتاب میں انہوں نے قدوری سے اہم اور

ضروری مسائل کا انتخاب کیا ہے۔ مؤلف کتاب کے مقاصد پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''اما بعد یہ کتاب تسہیل الضروری مسائل قدوری کو حل کرنے کے لیے لکھی گئی ہے اس کے لکھنے میں مَیں نے سوال و جواب کا طریقہ اختیار کیا تا کہ طالب علم کو جلدی سمجھ آجائے اور آسانی سے حفظ ہو جائے اور یہی طریقہ ذہن نشین کرنے کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اور میں نے اس کے مسائل کو خوب صورت، دل فریب اور واضح انداز میں ترتیب دیا ہے۔ میں نے طالب علموں اور عوام کا نفع محسوس کیا اور آسانی کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے بعض عنوانات کا جو اصل کتاب میں نہ تھے اضافہ کر دیا پس میری یہ کتاب آسان عبارت اور واضح بیان کا مجموعہ ہے۔'' (۳۵)

مترجم جناب مولانا عبدالغنی طارق نے پیش لفظ میں لکھا ''مولفؒ نے اگرچہ کتاب کو بہت آسان ترتیب سے مرتب فرمایا لیکن مزید وضاحت کے لیے بعض موقع پر فقہ کی دیگر کتب سے تفصیل حاشیہ میں نقل کر دی جو انتہائی مفید ہے۔لیکن بندہ نے ترجمہ کرکے دقت حاشیہ کی وہ عبارت جس پر عبارت کا سمجھنا موقوف تھا اس کا خلاصہ اصل عبارت میں مسئلہ کے بعد قوسین میں درج کر دیا ہے تا کہ عوام الناس حاشیہ کے افادہ سے بھی محروم نہ ہوا۔ (۳۶)

کتاب کا اُسلوب:

کتاب کا آغاز کتاب الطہارۃ سے کیا گیا۔ بعدازاں کتاب الصلوٰۃ ،کتاب الزکاۃ ،کتاب الصوم، کتاب الحج میں مسائل کو قدرے تفصیل کے ساتھ جبکہ کتاب البیوع سے کتاب الخنثیٰ تک (۲۴ کے قریب)ابواب ہیں جن میں احکام تجارت اور بیوع کی صورتیں اور مسائل پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسائل کا اُسلوب یہ اختیار کیا گیا ہے ۔عنوان قائم کر کے اس کے ذیل میں سوال و جواب بنائے گئے ہیں۔ سوالوں کے جواب کہیں مختصر اور کہیں طویل ہیں۔ عبارت میں کتب فقہ کا بھی حوالہ مختصراً موجود ہے۔ اسی طرح کہیں کہیں آئمہ کے اختلاف کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ جدید مسائل سے تعرض نہیں کیا گیا۔ مجموعی طور پر عوام الناس کی سہولت اور ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کتاب کو مرتب کیا گیا ہے۔

۲۔عصر حاضر میں فقہی ادب کی تسہیل کا منہج:

ماضی کی طرح دور جدید میں بھی فقہی ادب کی تسہیل وتفہیم کا کام جاری ہے ۔مگر دور

جدید کے تقاضوں کے پیش نظر اس کے منہج میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے ۔ اب بالعموم علماء و فقہاء عوام الناس کی طرف سے اٹھائے گئے سوالات اور اشکالات کا جواب دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس منہج کا بھی ایک بڑا ذخیرہ سامنے آیا ہے ۔ چند کتب کے اسلوب کا جائزہ پیش خدمت ہے ۔

۱.۲۔ رسائل و مسائل ازمولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی:

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی (م: ۱۹۷۹ء) نے اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں برس ہا برس لوگوں کے سوالوں کے جوابات 'رسائل و مسائل' کے نام سے دیے جنہیں بعد ازاں افادہ عام کے لیے اسی نام سے یکجا کرکے شائع کردیا گیا ہے ۔ حسب ضرورت بعض مقامات پر اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ ان سوالات میں مختلف تمدنی ، معاشی، سیاسی ،فقہی ، کاروباری اور عام مسائل شامل ہیں۔

رسائل و مسائل کی پہلی پانچ جلدیں مولانا مودودی کی تحریر کردہ ہین۔ جبکہ چھٹی اور ساتویں جلد جسٹس (ر) ملک غلام علی کے جوابات پر مشتمل ہیں۔ رسائل و مسائل کا یہ معروف سلسلہ اب بھی جاری و ساری ہے ، مولانا عبدالمالک اور ڈاکٹر انیس احمد اس سلسلے کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

مولانا خلیل احمد جامدی رسائل و مسائل کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں؛

> رسائل و مسائل کے نام سے (مولانا مودودی مرحوم) جو کتاب اردو میں پائی جاتی ہے وہ بظاہر سوالات کا جواب ہے مگر درحقیقت ، وہ اس ہمہ گیر جنگ کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتی ہے جس میں مرحوم نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک مشغول رہے ہیں۔ اس اجمالی خاکہ سے قارئین اندازہ کرسکتے ہیں کہ مرحوم ایک مفتی کے انداز میں سوالات کے جوابات دینے کی بجائے ایک معالج کے طرز پر مسائل سے ہم کلام ہوتے ہیں اور مائل جن الجھن اور جس شکایات سے دو چار ہے ، اپنے ناخن گرہ کشا سے اسے دور کردیتے ہیں۔ (۳۷)

بعض سوالات نہایت طویل ہیں بلکہ سوال میں نفس مسئلہ کی مکمل وضاحت کی گئی ہے ، اسی طرح بعض سوالوں میں سوال در سوالات ہیں۔ مولانا مودودی نے پورے تسلسل اور

جزئیات کے ساتھ ان کے جوابات دیے ہیں، اسلوب سادہ اور عام فہم ہے ،کہیں کہیں کتب فقہ سے بھی استدلال کرتے نظر آتے ہیں، اور عقلی استدلال سے بھی جوابات کو مزین کرتے ہیں۔ رسائل و مسائل کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے :

۱۔ تفسیر آیات و تاویل احادیث ۲۔ فقہی مسائل
۳۔ معاشی مسائل ۴۔ اختلافی مسائل
۵۔ عام مسائل

البتہ کہیں کہیں تحریکی سوالا ت اور سیاسی سوالات بھی اٹھائے گئے ہیں۔ نیز ہر جواب کے آخر میں ترجمان القرآن کی اشاعت کا بھی ذکر ہے ۔

۲.۲ تفہیم المسائل ازمولانا گوہر رحمٰن :

مولانا گوہر رحمٰن (م:۲۰۰۳ء) جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن ۔مردان کے شیخ القرآن و الحدیث تھے۔ تدریسی و تصنیفی کام کے علاوہ جماعت اسلامی پاکستان میں فعال کردار ادا کیا۔ مذکورہ کتاب اسی جامعہ کے شعبہ افتاء کی طرف سے طبع کی گئی ہے ، بالعموم ہر جلد میں سوالات اور توضیحات کی ترتیب کچھ یوں ہے :

۱۔ تفسیر و تاویل آیات اور تخریج و تشریح احادیث
۲۔ عام فقہی مسائل ۳۔ معاشی مسائل ۴۔ تحریکی مسائل

بالعموم مسائل کا نام اور پتہ بھی تحریر کیا گیا ہے اور مولانا نے بھی جوابات کے ساتھ اپنا نام اور تاریخ درج کی ہے ۔ دیباچہ طبع اول میں لکھتے ہیں:

> ہمارے پاس مختلف مسائل کے بارے میں استفسارات بھی آتے رہتے ہیں، جن کے جوابات میں خود دیتا ہوں، یہ مجموعہ انہی جوابات پر مشتمل ہے..... ترتیب میں جوابات و مقالات کی تاریخ کوملحوظ رکھا گیا ہے۔کوشش یہ کی گئی ہے کہ ہر جواب اور ہر مقالے میں قرآن وسنت کی نصوص سے استدلال کیا جائے اور تائید وتشریح میں فقہائے اسلام اور مفسرین ومحدثین کے اقوال بھی پیش کیے جائیں۔

سوالات کی ترتیب کسی فقہی کتاب کے اسلوب پر نہیں بلکہ مسائل کے سوال اور ضرورت پر ہے ، چند سوالات ملاحظہ ہوں:

۱۔ تراویح ۸ رکعت پڑھنی چاہئیں یا ۲۰ رکعت
۲۔ کیا مخصوص فقہ کی پیروی لازم ہے۔
۳۔ نماز تہجد کے لیے اذان دینا۔
۴۔ جزیرۃ العرب میں امریکی افواج کی موجودگی
۵۔ ووٹ کی شرعی حیثیت
۶۔ حجاب اور اجتماعی سرگرمیاں

اسلوب یہ ہے کہ پہلے عنوان قائم کیا جاتا ہے، پھر سوال یا سوالات درج کیے جاتے ہیں، جوابات بالتفصیل اور تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ احادیث سے استدلال کے علاوہ کتب فقہ سے عبارات اور حوالہ جات بھی درج کیے جاتے ہیں۔ بعض مقامات پر بھاری بھرکم اصطلاحات بھی نظر پڑتی ہیں اور عوام الناس کے اسلوب میں تفہیم کی بجائے مشکل پسندی در آتی ہے۔ آخری جلد (پنجم) مجموعہ مقالات ہے، سوالات پر مبنی نہیں ہے۔ (۳۸)

۲.۳ جدید فقہی مسائل از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

مذکورہ کتاب جدید فقہی مباحث از مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کا ایک لحاظ سے تسلسل ہے جو فقہ اکیڈمی انڈیا سے ۱۷ جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔ چنانچہ کتاب مذکورہ کا تعارف کراتے ہوئے مجاہد الاسلام قاسمی صدر مجلس تحقیقات اسلامی - حیدر آباد لکھتے ہیں:

> جدید صنعتی اور فکری انقلاب نے جو بہت سے مسائل پیدا کردیے ہیں، ان میں ایک جدید دور میں پیدا ہونے والے مسائل کا فقہی اور شرعی حل بھی ہے جو جدید ایجادات اور نئے معاملاتی نظام کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان مسائل کا حل کرنا ایک مشکل اور دشوار کام ہے ..... اس مشکل اور دشوار کام کا حل کرنا، علماء کے ذمہ ہے اور وہی اس کا صحیح حل تلاش کرنے کے اہل ہیں، چنانچہ ہر زمانہ کے اہل علم و ارباب افتاء نے اپنے اپنے دور کے مسائل حل کیے ہیں..... زیر نظر کتاب بھی اسی

سلسلہ کی ایک کڑی ہے ۔ مؤلف کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے پہلی بار ایسے تمام جدید مسائل کو جن کا تعلق عبادات، معاشرت، معاملات اور اجتماعی مسائل سے ہے، یکجا کر دیا ہے اور نہایت اختصار و ایجاز کے ساتھ سہل، عام فہم زبان اور دل نشیں اسلوب میں مسائل پر گفتگو کی ہے ۔ (۳۹)

فاضل مصنف رقم طراز ہیں:

''..... ان حالات میں ضرورت محسوس کی گئی کہ ایسی کتاب مرتب ہو جس میں جدید مسائل کا ممکن حد تک احاطہ ہو جائے ۔ زبان سہل اور عام فہم ہو۔ احکام مدلل لکھے جائیں اور حتی الوسع اختصار سے کام لیا جائے۔ یہ کتاب اس ضرورت کی تکمیل کی جانب ایک قدم ہے ۔ (۴۰)

فاضل مصنف نے کتاب میں روایتی موضوعات سے ہٹ کر جدید اور سائنسی موضوعات پر دینی و شرعی رہنمائی کی ہے ۔ کتاب کو ان موضوعات میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ عبادات، معاشرت، معاشیات، متفرات، تاہم ان کے تحت ذیل موضوعات بھی ہیں۔ فاضل مصنف نے جدید مسائل پر انطباق کیا ہے ۔ تاہم تہذیبی و تمدنی معمولات کو بھی پیش نظر رکھا ہے ۔ دور جدید کے ابھرتے ہوئے مسائل میں ہر روز اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔ اب تک پیش آنے والے مسائل پر عوام الناس کی عمدہ رہنمائی ہے۔

بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ عصر حاضر کے فقہاء کے لیے بھی بنیادی ماخذ کا کام دیتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ کتاب کے آخر میں مصادر و مراجع کی جامع فہرست بھی دی گئی ہے ۔

۲.۴ آپ کے مسائل اور ان کا حل از مولانا محمد یوسف لدھیانوی:

مذکورہ کتاب مفتی محمد یوسف لدھیانوی کے اخبار سلسلہ وار کالم'' آپ کے مسائل اور ان کا حل'' کا مجموعہ ہے۔ اس سلسلہ کا آغاز ۱۹۷۸ء سے روزنامہ جنگ کے ایڈیشن'' اقراء''

سے ہوا ہے ۔عوام الناس اپنی علمی تشنگی اور روزمرہ امور میں پیش آنے والے امور سے متعلق مولانا سے استفادہ کرتے ہیں۔مولانا کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۸۶ء میں پہلی جلد منظر عام پر آئی۔ اب تک آٹھ جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

کتاب کی ترتیب یوں ہے کہ سب سے پہلے مرکزی عنوان قائم کیا جاتا ہے ۔ پھر ذیلی عنوانات کے تحت سوالات درج کیے جاتے ہیں۔سوالات کس کی طرف سے کب کیے گئے ان کی کوئی صراحت نہیں ہے۔

بعض سوالات بہت طویل ہیں، جوابات مختصراً ہیں۔ تاہم صورت مسئلہ واضح واجاتی ہے ۔مولانا کا اسلوب یہ ہے کہ قرآنی آیات کا مفہوم اپنے الفاظ میں نقل کردیتے ہیں، البتہ کہیں کہیں قرآنی آیات کو درج بھی کردیتے ہیں۔ احادیث سے استدلال کا بھی یہی اسلوب ہے ۔صفحہ آدھ صفحہ کے سوالات کو ایک آدھ سطر میں بھی نپٹا دیتے ہیں ، تاہم بعض مسائل پر تفصیلی بحثیں بھی موجود ہیں مثلاً مزارعت کا جواز و عدم جواز (۴۱) اس طرح کی بحث مدلل ہوتی ہے ۔سوالات کی نوعیت اجتماعی بھی ہوتی ہے اور انفرادی ونجی بھی تاہم مولانا کہیں فتویٰ کے انداز میں اور کہی استحباب کے انداز میں جواب دیتے ہیں اور لوگوں کی شریعت کی روشنی میں رہنمائی کرتے ہیں۔

۲.۵ تفہیم المسائل از پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن:

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے رکن بھی ہیں اور رویت ہلال کمیٹی پاکستان کے چیئر مین بھی ہیں۔ ۲۰۰۰ء سے روزنامہ ایکسپریس جمعہ ایڈیشن (دین و دانش) میں قارئین کے ارسال کردہ سوالات کے جوابات دیتے ہیں۔ مذکورہ کتاب انہی سوالات و جوابات کا مرتب مجموعہ ہے ۔

مفتی منیب الرحمٰن نے سوالات کے جوابات میں نہ تو اختصار سے کام لیاہے اور نہ ہی

دلائل کا انبار لگایا ہے بلکہ حتی الوسع توسط و اعتدال سے کام لیا ہے۔حسب ضرورت مختصر دلائل اور جوابات بھی درج کیے تا کہ اہل علم کی تسکین ہو۔

اسلوب یہ ہے کہ عنوان اور سوال درج کیا ہے، نیز سائل کا نام مع مقام و مرتبہ کے بھی لکھا ہے، سوالات کا دائرہ ضرورت ہے۔گویا کتاب کی ترتیب مولانا کی نہیں سائلین کی ہے۔

جوابات کے استدلال میں فتاویٰ جات بالخصوص فتاویٰ امام احمدرضا خان بریلوی کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔بعض معاصر علماء کی تائید بھی کرتے ہیں اور کہیں کہیں نقد بھی ہوتا ہے۔ سوالات کا تعلق روز مرہ ضروریات اور مسائل سے ہے۔سوالا ت روایتی بھی ہیں ارو جدید بھی۔مثلا ایک سوال کیا میت کی آنکھیں نکالی جاسکتی ہیں (۴۲) اسی طرح سائنسی توجیہات بھی پیش نظر رکھی ہیں۔انگریزی اصطلاحات کا استعمال بھی جا بجا ہے اور مسلکی رجحان بھی جھلکتا ہے۔

۲.۶۔زندگی کے عام فقہی مسائل از رضی الاسلام ندوی:

رسائل ومسائل پاکستان کے ترجمان القرآن کی طرح ہندوستان کے معروف علمی ودینی ماہ نامہ زندگی نو کا ایک مستقل سلسلہ ہے۔جس میں دورحاضر میں درپیش مسائل پرسوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۶ء اس مجلّے کے مدیر سیداحمدعروج قادری جوابات دیتے رہے۔ پھر ادارہ تحقیق وتصنیف علی گڑھ کے ڈاکٹر محمدرضی الاسلام ندوی جواسب دینے لگے ہیں۔زیرنظر کتاب ندوی صاحب کے جوابات کا مجموعہ ہے۔جوابات قرآن وسنت کی روشنی میں تمام فقہوں (احناف ،شوافع،حنابلہ اور مالکیہ) کومدنظر رکھ کر دیے گئے ہیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں نت نئے مسائل سامنے آرہے ہیں۔ دوران نماز موبائل فون کی گھنٹی ، کرنسی نوٹ میں نصاب زکوۃ، حجاب اور برقعہ، ملازمت پیشہ خواتین کا پردہ، دینی اجتماعات کی فوٹوگرافی اورخواتین کے اجتماعات میں پروجیکٹر کااستعمال وغیرہ۔

ندوی صاحب نے اس نوعیت کے جملہ مسائل کا جوابات متوازن اور مناسب انداز

میں دیے ہیں۔مثلا اگر دوران نماز موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگے تو کیا کرنا چاہیے؟

جواب میں مسجد کی اہمیت ،عبادت کی روح اور خشوع اور خضوع کی اہمیت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: موبائل دوران نماز ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر یا باہر نکال کر فوراً بند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔اگر اسی طرح بند نہ ہوتو نمازتوڑکر موبائل فون بند کردیں اور دوبارہ نماز میں شامل ہوجائیں۔(۴۳)

عصری مسائل کے علاوہ بھی کتاب میں بہت سے شرعی مسائل کا جواب نہایت متوازن اور مدلل انداز میں دیا گیاہے۔مثلا نمازفجر کی سنتیں، عورتوں کی نماز، نمازوتر کی رکعتیں اور خواتین اور زیارت قبور وغیرہ۔

۳۔تسہیل کتب میں پیش نظر امور:

مذکورہ بالا کتب کے تفصیلی مطالعہ سے مندرجہ ذیل امور بطور مشترک پہلو کے سامنے آتے ہیں:

۱۔ برصغیر میں کتب فقہ کی تسہیل وتفہیم کم وبیش تمام مکاتب فکر میں نظر آتی ہے چونکہ اہل سنت والجماعت کی تعداد زیادہ ہے لہذا کتب بھی اسی نقطہ نظر کی زیادہ ہیں۔

۲۔ نہ صرف زبان سادہ اور عام فہم ہے بلکہ نام بھی ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے عوامی اسلوب کا اظہار ہو جیسے آسان فقہ ،تفہیم المسائل اور تعلیم الاسلام وغیرہ۔

۳۔ مصنف نے کتاب کے مقدمہ میں اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ عوام الناس کے لئے کتاب مرتب کی جارہی ہے ۔علاوہ ازیں دیگر طبقوں مثلا مبتدی، بچوں اور عورتوں کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

۴۔ کتب میں مشکل اصطلاحات اور اختلافی مسائل سے عمدا گریز کیا گیا ہے ۔اگر کہیں اصطلاحات کا استعمال ناگزیر سمجھا گیا ہے تو آغاز میں ہی اصطلاحات کی الگ سے وضاحت کردی گئی ہے۔

۵۔ بالعموم کتب میں فقہ حنفی کی تعبیر کو مدنظر رکھا گیا ہے اور مآخذ بھی وہی پیش نظر رکھے گئے مثلا الدرالمختار، البحرالرائق ،شامی ،فتح القدیر،الھدایہ،فتاوی عالمگیری اور کنزالعمال وغیرہ۔علاوہ ازیں بعد میں مرتب کرنے والوں نے پہلی کتب کو بھی اپنے مآخذ میں شامل کر لیا ہے جیسے بہشتی زیور، بہارشریعت اورعلم الفقہ وغیرہ۔

۶۔ بالعموم مذکورہ کتب کے مؤلفین نے حوالہ جات کا ہتمام نہیں کیا کیونکہ اس سے عبارت ثقیل ہو جاتی ہے۔لہذا بغیر حوالہ ہی مسائل اخذ کر کے اپنے الفاظ میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔اگر کہیں حوالہ جات ناگزیر بھی ہوئے تو حواشی میں انہیں لایا گیا ہے۔

۷۔ فقہی ادب کی تسہیل میں عبارت کو سہل اور عام فہم بنانے کے لیے کئی پیرائے اختیار کیے گئے ہیں مثلاً سوال و جواب کا انداز اختیار کرنا ، چھوٹے چھوٹے جملے بنانا ، مضامین کے عنوان دلچسپ اور مسائل میں اختصار برتنا وغیرہ ۔

۸ ۔ ہرمصنف نے اپنے دور کے ممکنہ جدید مسائل سے اعتناء کیا ہے ۔ چونکہ روزمرہ مسائل آئے روز پیچیدہ اورمشکل ہوتے جاتے ہیں لہٰذا ان کتب میں بھی ایک ارتقاء نظرآتا ہے مثلاً ابتدائی دور میں ریل کے سفر کے احکام نظرآتے ہیں بعدازاں ہوائی جہاز کے سفر کے احکام بھی زیربحث لائے جاتے ہیں یہ ارتقاء معاشرت کے کم وبیش ہر پہلو میں نظرآتا ہے۔

۹۔ بالعموم ہرمکتب فکر اپنی اپنی فقہ و مسلک کے مطابق ہی مسائل کی وضاحت کرتا ہے دوسرے کی فقہ اورمسلک میں بہت کم دخل دیا گیا ہے تاہم اکا دکا مقامات پربعض فروعی مسائل میں دوسروں سے بھی تعرض کیا گیا ہے البتہ فقہی مکاتب کی تقسیم گہری ہونے کی وجہ سے اپنے مسلک کی شخصیات اور کتب کو بطور خاص مدنظر رکھا گیا ہے۔تاہم مسائل اس امتیاز سے بالاتر ہے۔

تجاویز و سفارشات :

برصغیر میں مذکورہ بالا فقہی ادب کے تجزیے کے بعد درج ذیل سفارشات پیش کی جاسکتی ہیں :

۱۔ بیشتر کتب صدی پون صدی قبل لکھی گئی تھیں ان کی زبان و اسلوب قدیم ہے انہیں جدید اسلوب میں بلکہ مزید سہل انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ دور جدید ذرائع ابلاغ کا دور ہے ان کتب کو مختلف سائٹس پر ڈالا جاسکتا ہے تا کہ وہ افراد جو مطالعہ کا وقت نہیں پاتے وہ یہاں پر کتب دیکھ سکیں۔

۳۔ بعض کتب نہایت ضخیم ہیں ان کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں الگ کرکے شائع کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ یہ دور فروعی اور مسلکی تنگ نظریوں سے نکلنے کا ہے۔فقہی ادب میں بھی ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو مسالک کی بجائے دین اسلام کی نمائندگی کرے۔

۵۔ قدیم کتب زیادہ تر ہاتھ سے لکھی گئی ہیں۔ نیز حوالہ جات میں بھی اختصار ہے ان کتب کو مشینی کتابت پر شائع کیا جائے اور حوالہ جات کو بھی مکمل کیا جائے۔

امید ہے کہ مذکورہ تجاویز کے پیش نظر فقہی ادب کو زیادہ مفید اور عام فہم بنایا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

۱۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، عقدالجید فی الاحکام اجتہاد والتقلید، ص:۳۶

۲۔ تھانوی، اشرف علی، مولانا، بہشتی زیورمکمل ومدلل، مکتبہ برہان اردو بازار، جامع مسجد دہلی، ۱۳۲۰ھ۔

ص:۵ (مذکورہ کتاب دوجلدوں پر مشتمل ہو جس میں کل گیارہ حصے ہیں، ہرحصہ ایک سو سے سوا سوصفحات پر مشتمل ہے۔)

۳۔ ایضا، ص:۲

۴۔ ایضا، ص:۴

۵۔ ایضا

۶۔ ایضا

۷۔ رضوی، امجد علی، محمد، بہارشریعت، شیخ غلامی علی اینڈ سنز تاجران و ناشران کتب، کشمیری بازار لاہور،

۱۳۴۸ھ، جلد ۱، ص:۳

۸۔ ایضا، جلد ۸، ص:۱۷

۹۔ ایضا، جلد۲، ص:۹۷

۱۰۔ ایضا، جلد ۱، ص:۵۱

۱۱۔ ایضا، جلد ۱، ص:۶۴

۱۲۔ نذیر احمد، ڈپٹی، الحقوق والفرائض، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور، جولائی، ۱۹۷۹ء، تمہید، ص:۱۱

(مذکورہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے، تینوں کو یکجا کردیا گیا ہے۔کل صفحات ۴۲۳ ہیں)

۱۳۔ ایضا، ص:۱۳۶۔۱۴۲

۱۴۔ دہلوی ، کفایت اللہ ، مفتی ، تعلیم الاسلام ، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور ، ص:۲۱ (کل چار حصے ہیں، حصہ اول ۳۱ صفحات ، حصہ دوم ۲۴ صفحات ، حصہ سوم ۱۰۸ ، اور حصہ چہارم ۱۱۵ صفحات پر مشتمل ہے ۔

۱۵۔ لکھنوی ، عبدالشکور ، مولانا ، علم الفقہ چھے حصے کامل اردو ، دارالاشاعت ، مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی نمبرا ، ۱۹۶۰ء، ص: سرورق ، (کتاب کے کل صفحات ۲۷۷ ہیں)

۱۶۔ ایضا ، ص:۲۳، ۲۴

۱۷۔ ایضا ، تقریظ از مفتی محمد شفیع

۱۸۔ الحداد ، محمد عاصم ، فقہ السنہ ، الفیصل ناشران وتاجران کتب ، اردو بازار لاہور ، ۱۹۹۸ء ، مقدمہ ص:۲۹ (مذکورہ کتاب دوحصوں پر مشتمل ہے ۔صفحات بالترتیب ۴۷۹ اور ۴۵۳ ہیں ۔)

۱۹۔ ایضا ، ص:۲۹، ۳۰

۲۰۔ ایضا ، ص:۳۱

۲۱۔ ایضا ، ص:

۲۲۔ ایضا ، ص:۳۴

۲۳۔ اصلاحی ، محمد یوسف ، آسانہ فقہ ، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۷۱ء
(مذکورہ کتاب دوحصوں پر مشتمل ہے ۔حصہ اول ۴۹۰، حصہ دوم ۴۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔)

۲۴۔ ایضا ، حصہ اول ، ص:۴

۲۵۔ ایضا ، ص:۷

۲۶۔ ایضا ، ص:۶۱

۲۷۔ ایضا ، ص:۲۹۹

۲۸۔ ندوی ، مجیب اللہ ، مولانا ، اسلامی فقہ ، پروگریسو بکس ، ۴۰ بی اردو بازار لاہور ، ۱۹۵۷ء ، سرورق (مذکورہ کتاب دوحصوں پر مشتمل ہے ۔حصہ اول ۵۳۰ اور حصہ دوم صفحات پر مشتمل ہے۔)

۲۹۔ ایضا ، دیباچہ ، ص:۱۱، ۱۲

۳۰۔ ایضا ، ص:۶

۳۱۔ مینائی ، منہاج الدین ، مولانا ، اسلامی فقہ کا انسائیکلوپیڈیا ، نگارشات پبلشرز ، ۳۸ مین اردو بازار لاہور ، ۲۰۰۶ء ، ص ۳۱

۳۲۔ ایضا ،ص:۳۵

۳۳۔ ایضا ،ص:۱۱۶،۱۱۷

۳۴۔ ندوی ، مجیب اللہ ،مولانا ، اسلامی فقہ،ص۲۵

۳۵۔ بلند شہری ، عاشق الٰہی ،مفتی ،تسہیل الضروری لمسائل القدوری ، (اردو ترجمہ بنیادی فقہی احکام از مولانا عبدالغنی طارق) ادارۃ القرآن والسنۃ ،کراچی ،ص:۱۰

۳۶۔ ایضا ،ص:۱۱،۱۲

۳۷۔ مودودی ، ابوالاعلیٰ ، سید ، رسائل و مسائل ، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ، پاکستان اچھرہ لاہور ، ۱۹۵۱ء ،ص:۴

۳۸۔ گوہر رحمٰن ،مولانا ،تفہیم المسائل ، مکتبہ تفہیم القرآن ، مردان ، ۱۹۹۹ء ،

۳۹۔ ایضا ، دیباچہ طبع اول ،

۴۰۔ رحمانی ، خالد سیف اللہ ، جدید فقہی مسائل ، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز دہلی ،۱۹۸۳ء ، تقدیم ص:۸

۴۱۔ ایضا ،سخن ہائے اولین ،ص:۱۸

۴۲۔ لدھیانوی ، محمد یوسف ، آپ کے مسائل اور ان کا حل ، مکتبہ لدھیانوی ، بنوری ٹاؤن ، کراچی ، ۱۹۸۶ء

۴۳۔ ایضا ،ص:۱۱۲

۴۴۔ منیب الرحمٰن ،مفتی ،تفہیم المسائل ، ضیاء القران پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء (مذکورہ کتاب کے اب تک ۳ حصے شائع ہو چکے ہیں ۔)

۴۵۔ ایضا ،ص:۱۵۷

۴۶۔ ندوی ، رضی الاسلام ، رسائل و مسائل ،اسلامک ریسرچ اکیڈمی ،فیڈرل بی ایریا،کراچی،

۴۷۔ ایضا ، ص:۱۸،۱۹

مجلہ تحقیق
کلیہ علوم شرقیہ
جلد31 اپریل ــ جون 2010، شمارہ 79

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 31, Sr.No.79, 2010, pp 81 – 128

اللغة العربية في شبه القارة
أثناء عصرالاستعمار الإنجليزي
(تحديات واستجابات)

د. مقيت جاويد[1]

Abstract:
With the arrival, in 18th century, of the British Imperialists in the subcontinent, Arabic Language, a symbol of the glorious past of the Muslims, had to face a new challenge of survival. Undoubtedly, this language had the honour of being an Official Language of the land for over 400 years of the Arab rule (712-1025 A.D.) as well as a sole intellectual-cum- literary tool of expression of the Muslims in later centuries. But with the advent of British Imperialism, Arabic Language had to take a "defensive approach" as English Language started gaining a foothold in the subcontinent. This is the central theme of this research paper. We have reviewed various challenges faced by Arabic vis-à-vis English in its struggle to survive and sustain in a seemingly unfriendly atmosphere. Analyzing the status of Arabic in educational institutions of both public and private sectors, we also have endeavored to shed some light on the contributions of the scholars, British as well as native, to the Arabic literature.

حين ما دخل الإنجليز في شبه القارة فاتحين، كان من الطبيعي أن تدخل لغتهم، وثقافتهم، وعلومهم معهم لكى تتوغل في أفئدة السكان المحليين تدريجيا لأن عادات وتقاليد ولغات الشعب الحاكم تؤثر تأثيرا باهرا على معيشة الشعب

[1] الأستاذ المساعد بقسم اللغة العربية، جامعة بنجاب، لاهور.

المحكوم. إذ أن الاستعماريين كانوا يريدون أن يحكموا شعوبا تختلف ألسنتهم، وعقائدهم، وخصائصهم العرقية، لكنهم اتفقوا، على مرور القرون، على قيام مجتمع هندي شامل تسوده اللغتان، اللغة الفارسية كلغة رسمية والعربية كلغة علمية، فلم ترقهم هذه الوحدة والتي ما زالوا يعتبرونها سما قاتلا، فجعلوا، من أوائل أمرهم، يخططون خططا، ويؤامرون مؤامرات تفرق فيما بينهم، وتجعلهم أحزابا ممزقة غير مؤتلفة.

وبنت القوة الاستعمارية خططهم الماكرة على اللغة حيث أخذت تشجع على تطوير اللغات المحلية الإقليمية، وتضغط اللغتين الفارسية والعربية. وكانوا بذلك يريدون أن يبدوا خلوصهم واهتمامهم بمصالح المحليين، لكن ما تخفي صدورهم أكبر، كانوا، في الحقيقة، يحاولون أن يقضوا قضاءا نهائيا على مكانة المسلمين المتفوقة في المجتمع الهندي. ومن النتائج المترتبة – حسب زعمهم – على تنفيذ هذه الخطة اللغوية هو أنه، أولا، ينتهي جو الوفاق والتآلف بين الشعوب المحلية الذي تحصّل بعد امتزاج ممتد عبر القرون، وتأخذ مكانه مشاعر التخاذل والبغضاء والعداوة. وكذلك، بعد زوال الوصلة اللغوية يحيط بآفاق شبه القارة الهندية والباكستانية الإحساس بـــ "الغرابة" الذي لا يمكن إبعاده أو زواله. ثانيا، تمحو جميع الشعوب في شبه القارة، وخاصة المسلمون، تقاليدها الثقافية والدينية عن أذهانهم، وتفقد كنوزها المعرفية التي ما زالت تحفظها منذ القرون. وبالتالي، يسقطون جميعهم في هوة العميان الثقافي والديني. ثالثا، يترسخ في قلوبهم آثار تفوق الشعب الغالب، ولا يفيقون من عقدة الدونية هذه أبدا.[1]

وإذا استعرضنا ألفاظ اللورد ميكالي، عضو مجلس البرلمان البريطاني، في خطابه الذي ألقاها في البرلمان سنة **1935**، اتضحت لنا الفكرة الاستعمارية تجاه الثقافات المحلية تماما. يقول:

" I have traveled across the length and breadth of India and I have not seen one person who is a beggar, who is a thief. Such wealth I have seen in this country, such high moral values, people of such caliber, that I do not think we would ever conquer this country, unless we break the very backbone of this nation, which is her spiritual and cultural heritage, and, therefore, I propose that we replace her old and ancient

education system, her culture, for if the Indians think that all that is foreign and English is good and greater than their own, they will lose their self-esteem, their native culture and they will become what we want them, a truly dominated nation."[2]

(قد سافرت في طول الهند وعرضها، ولم أجد أي سائل أو سارق هناك. ولا أظن، بعد أن شاهدت ثروة وقيما أخلاقية وسكانا نجباء فيها، أننا نستطيع أن نفتحها أبدا إلا أن نكسر العمود الفقري لهذا الشعب، وهو تراثه الروحي والثقافي. ولذلك أقترح بأن نستبدل ثقافته ونظامه التربوي العريقين لأن الهنديين إذا اعتقدوا بأن كل ما هو أجنبي أو إنجليزي أحسن مما عندهم، افتقدوا أنانيتهم وثقافتهم، وأصبحوا كما نحب ونشاء، الشعب المغلوب الحقيقي.)

هذا جانب. وفي الجانب الآخر قام المسلمون معتنين بحفظ ثقافتهم ولغتهم الدينية التي مازالت علامة مجدهم وسبب مفخرتهم عبر القرون، فاصطنعوا خططا حاولوا بها محاولة جادة ليعيدوا إلى لغتهم مكانتها الثقافية والعلمية المفقودة.

وفي هذه المقالة نحلل أولا أوضاع اللغة العربية في مجال التعليم الرسمي والدور الذي قامت به السلطة الإنجليزية من دعم تعليم اللغة العربية تارة وضغطه تارة أخرى ثم نذكر بشيئ من التفصيل الجهود الجبارة التي قام بها الشعب المسلم عامة وعلماءه خاصة في استجابة التحديات للغة العربية وآدابها.

أ – أوضاع اللغة العربية في القطاع الرسمي تحت حكم الإنجليز

قدوم الإنجليز في شبه القارة:

إن تأريخ قدوم البريطانيين في شبه القارة يبدأ من بداية القرن السابع عشر الميلادي عند ما أقاموا، مستغلين ضعف السلطة المركزية بدهلي، وكالاتهم التجارية، والتي أدت إلى إنشاء شركة الهند الشرقية، عند "سورت" في غرب الهند و "هوجلي" في شرقها بعد أن نالوا الامتيازات من قبل ملوك الهند جزاء بما ساعدوهم في حربهم للبرتغاليين عند الشواطئ الشرقية. وبعد معركتى بلاسي (1757م) وبكسر(1765م)، جعلوا يمدون نفوذهم إلى مدن أخرى حتى استولوا على البنغال و أودهـــ عمليا، واقتصر حكم الملك المغولي على دهلي وأطرافها. وحين دخل القائد الإنجليزي "ولسلي" مدينة دهلي فاتحا، لم يجد السلطان المغولي، شاه عالم، بدا إلا أن يقتنع بما خصص له هؤلاء المستعمرون من راتب قليل وحياة

مجهولة. وفي صورة الثورة الوطنية عام 1857م التي كان هدفها القضاء على نفوذ الإنجليز في الهند والتي يعرفها البريطانيون بـــ "ثورة العصيان"، أتيحت للملوك المغوليين فرصة إعادة قوتهم المغصوبة. لكنها، ياللأسف، ضاعت، وبالتالي طويت صفحة الدولة الإسلامية الرمزية بالهند، وانضمت شبه القارة الهندية كلها إلى الإمبراطورية البريطانية لتحكمها حكما مباشرا حتى سنة إنشاء باكستان 1947م.[3]

مكانة اللغة العربية في النظام التعليمي للمسلمين قبيل ثورة 1857م:

عرّف الإنجليز في شبه القارة بنظام تعليمي جديد على أساس تعليم اللغة الإنجليزية، ومعرفة العلوم الحديثة والتكنولوجيا معتبرين النظام القديم " نظاما لا فائدة له ".

وقبل أن نتقدم إلى ذاك النظام الجديد، يجب لنا أن نعرف نبذة عن طبيعة النظام التعليمي المروج قبيل مجيئ الإنجليز، ومكانة اللغة العربية فيه ومدى تأثيرها في نفوس المسلمين.

لا نجد شيئا مفصلا ومسجلا عن أوضاع ومناهج تعليم المسلمين في شبه القارة قبيل قدوم الاستعمار الإنجليزي. وما نتأكد به في هذا الصدد، هو أن اللغة العربية كان لها شأن عظيم في نظام المسلمين التعليمي. تعلم اللغة العربية عند مسلمي شبه القارة الهندية والباكستانية جزء لا يتجزأ من الدين الإسلامي. كان تعليم الاطفال يبدأ بتعليم اللغة العربية عادة. وذلك إذا كان الطفل يبلغ عمره أربع سنوات، وأربعة أشهر، وأربعة أيام، يجتمع في بيت أبويه الأقرباء والأحباء، ويلبسونه أحسن ثياب، ثم يدعى عالم ديني، فيقرؤه آيات من القرآن الشريف، كما يعلمه أبجديات اللغة العربية. وبهذا تبدأ المرحلة الأولى من تعليمه، ثم يرسل إلى مدرسة حيث يتعلم الكتابة والقراءة على طريقة معتادة ومألوفة.

تعليم اللغة العربية في المدارس:

كانت المعاهد التعليمية المحلية منقسمة في قسمين، المعاهد الدينية والمدارس الابتدائية. ثم تنقسم كلتاهما في قسمين آخرين، فالمعاهد الدينية كانت منقسمة في "بتشالات" للهنادكة، و "المدارس" للمسلمين كما كانت تقسم المدارس الابتدائية في المدارس العربية والفارسية، ومدارس اللغات الهندية.[4]

أما اللغة العربية، فكانت هي وسيلة التعليم في آلاف من المدارس العربية المتواجدة في أطراف شبه القارة. حينما أحصى المستشرق المبشر الإنجليزي وليام آدم هذه المدارس في تقريره الثالث الذي قدمه في سنة 1838م، وجد أن عددها تبلغ 3654 مدرسة في خمس محافظات من إقليم البنغال فقط.[5]

تعليم اللغة العربية في المعاهد العليا:

وعلى مستوى الكليات، لم تتخلف اللغة العربية من أخواتها الأخرى المحلية. ويكفي بنا ما ذكره السيد نورالله على سبيل المثال:

" وتوضح التفاصيل بأنه كانت توجد في سورت كلية عظيمة للدراسات العليا.كانت هذه الكلية مفتوحة للبوهريين، وتدار على حساب الصنادق الأهلية ما مقدارها 32000 روبية سنويا، وتدرس اللغة العربية هناك. وكان عدد الأفاضل البوهريين الذين أغلبيتهم رجال كبار العمر يبلغ 125. كان هؤلاء الفضلاء يأتون إليها من جميع أطراف الهند. أصبحت هذه الكلية مفخرة ليست للبوهريين فقط، بل لجميع الناس في الهند الغربية".[6]

مراحل اللغة العربية في عصر الاستعمار الإنجليزي:

اجتازت اللغة العربية في العصر الاستعماري بمراحل عديدة، فهناك مرحلة نالت هذه اللغة اهتماما بالغا من قبل السلطة الاستعمارية حيث أنشأت مدارس وكليات ومعاهد لتعليم اللغة العربية، كما كانت هناك مرحلة أخرى نبذها المستعمرون وراء ظهورهم، وعاملوها معاملة العداء والبغض مفضلين اللغات الأخرى عليها. وكان السبب الظاهر لاهتمام المستعمرين باللغة العربية وأخواتها المحلية تحقيق هدفين معاً، وذلك ، أولاً، لتعليم موظفيهم الإنجليز اللغات المحلية والدينية، من أردية، وفارسية، وعربية، وسنسكريتية لكى يسهل لهم الاتصال بالمحليين، والوقوف على تراثهم العلمي والأدبي لفهم نفسيتهم، وعاداتهم، وتقاليدهم، وثانياً، لمنع المسلمين الذين كانوا يحتقرون الإنجليز من الرجوع إلى العلماء والمدارس الدينية لتعلم لغتهم المقدسة.[7]

اللغة العربية في عهد حكم شركة الهند الشرقية:

يشتمل مسير اللغة العربية في عصر حكم شركة الهند الشرقية على مراحل تالية:

المرحلة الأولى من سنة 1765م إلى سنة 1813م:

بدأت هذه المرحلة عند ما برزت شركة الهند الشرقية بقوة سياسية عسكرية بعد أن نجح القائد الإنجليزي كلائيو(Clive) في حرب بلاسي سنة 1757م، وأخذت إجازة جمع الضرائب (ديواني) من قبل الملك المغولي في البنغال وأوريسا وبهار سنة 1765م[8].

لم تتغير أوضاع العلوم العربية في هذه المرحلة، بل بقيت على حالها الذي كانت عليه قبل قدوم الاستعمار كما جعلت العلوم الأوروبية عامة واللغة الإنجليزية خاصة تدب رويدا رويدا إلى نظام التعليم الهندي.

وتفصيل ذلك أن الشركة، حتى سنة 1765م، كانت تهتم بتعليم الأطفال الأوروبية خاصة، لكن بعد تلك السنة، جعلت تعتني بتعليم المحليين المسلمين والهنود كليهما إذ أنها تعتبرنفسها "خلف" الحكام المسلمين الذين حكموا بلاد السند والهند لقرون. فمن بين المدارس التي فتحها الإنجليز للمسلمين خاصة نخص بالذكر هنا " مدرسة كولكتا". أسسها الحاكم العام وارن هاستنكز(Warren Hastings) في سنة 1780م لتأليف المسلمين أولا وتأهيلهم المناصب الحكومية ثانيا، وعين الشيخ مجد الدين عميدها كما قرر مبلغا ضخما لإدارتها. كان الطلاب من جميع الأقطار الهندية يتوجهون إليها ويقيمون بها لسبع سنوات.[9]

يقول الدكتور زبيد أحمد بهذا الصدد:

"East India Company also contributed a great deal to the cause of Muslim learning in India by the establishment of the famous madrasa at Calcutta."[10]

(أسهمت شركة الهند الشرقية أيضا إسهاما كبيرا في هدف التعليم للمسلمين في الهند بإنشاء مدرسة شهيرة في كولكتا.)

اتبعت هذه المدرسة الطريقة المعتادة التقليدية لتعليم المسلمين التي تعتمد على " التشجيع على الدراسات الشرقية في اللغة العربية".[11]وبعد وارن هاستنكز وجدت اللغة العربية وعلومها مساعدا آخر في صورة اللورد منتو (Minto)احاكم العام الذي مكث في شبه القارة من سنة 1806م إلى سنة 1813م والذي ما زال يدعو الشعب الإنجليزي إلى قراءة وحفظ "الأدب الشرقي والثقافة الهندية".

وحين ما أصدر قانون سنة **1813**م الدستوري، نالت اللغة العربية مع اللغات الأخرى مزيدا من الاهتمام، وذلك بسبب المرسوم البرلماني الذي يوجب على الحاكم العام بأن " يخصص ألف مئة روبية سنويا لإحياء وتطوير الأدب القديم في اللغة العربية أو السنسكريتية ومساعدة المحليين الهنديين، وأن يؤسس المدارس والمعاهد الأخرى في ولايات فورت وليام، وفورت سينت جورج، أو بومباى أو في أي منطقة بريطانية في الهند".[12]

المرحلة الثانية من سنة 1813م إلى سنة 1853م:

انقسمت هذه المرحلة في فترتين، فترة ما قبل سنة 1833م، وفترة ما بعد سنة 1833م حتى سنة 1853م.

تميزت هذه المرحلة بنشوب النزاع المرير والمديد بين اللغتين العربية والإنجليزية في أيهما أحق وأجدر بأن تكون لغة وسيلة التعليم في شبه القارة. قسم هذا النزاع رجال الحكومة الاستعمارية في ثلاث طوائف:

الطائفة الأولى كانت تشتمل على ضباط الشركة الذين كانوا يعملون في البنغال، ويؤيدون خطتى وارن هاستنكز واللورد منتو اللتين تشجعان على الدراسات العربية، وتقترحان بأن العلوم والمعارف الغربية تجب بأن تدرس بوسيلة اللغة العربية.

والطائفة الثانية تتعلق بالرجال من أمثال مانرو (**Munro**) وإلفنستون (**Elphinstone**) الذين يعتقدون بأن وسيلة التعليم في الهند تجب بأن تكون اللغات الهندية الحديثة لا غير، إذ أن هذه هي الطريقة الوحيدة التي تصل بها المعارف الغربية إلى عامة الناس.

والطائفة الثالثة كانت محتوية على الشباب الموظفين المدنيين في الشركة الذين يتعلقون بالتبشير، وكانوا جميعهم يساندون رأي العالم الإنجليزي غرانت (**Grant**) بأن اللغة الإنجليزية فقط تستحق بأن تكون وسيلة التعليم في شبه القارة. وهذه الوجهة النظرية، ولو تضاءلت في أول الأمر، جعلت تنال عناية وشعبية في آخر هذه المرحلة حين زار اللورد ميكالى الهند، وأخذ زعامة هذه الطائفة.[13]

وإذا أردنا أن نقيس مدى تأثير هذه الطوائف الثلاث في نشكيل الخطات التعليمية خلال هذه المرحلة، نجد أن وجهة الطائفة الأولى النظرية ما دامت تسود في الحلقات المخططة للتعليم في الفترة الأولى من هذه المرحلة، بينما سيطر رجال وجهة النظر الثالثة عملية تشكيل الخطط التعليمية في الفترة الأخيرة.

في العقد الخامس من القرن التاسع عشر، كانت المناطق تحت سيطرة الإنجليز منقسمة في خمسة أقاليم، وهي البنغال، وبومبائي، ومدراس، والأقاليم الشمالية الغربية (يو– بي)، والبنجاب. وفيما يلي نحاول أن ندرس آثار الخطات التعليمية الرسمية في هذه الأقاليم عامة وفي البنغال خاصة خلال هذه المرحلة.

البنغال:

كان البنغال هو أول إقليم قام بإعادة عملية تنظيم التعليم. في شهر يوليو من سنة 1823م، شكل الحاكم العام "اللجنة العامة للمعارف" المشتملة على عشرة أعضاء، أهمهم أيتش–تي–بيرنسب (H.T. Prinsep) وأيتش–أيتش– ولسون (H. H. Wilson) اللذان لهما إسهام مهم في ترقية اللغة العربية آنذاك، كما عين مئة ألف روبية لتنفيذ المشاريع التي تقترحها اللجنة.[14]

إذ أن تلك اللجنة كانت تحتوي أعضاء يرون بتشجيع اللغة العربية في النظام التعليمي الهندي، قامت بخطوات، خلال سنة 1833م إلى سنة 1853م، أعجبت محبي اللغة العربية في شبه القارة. وتلك الخطوات هي:

(أ) إعادة تنظيم مدرسة كولكتا حيث كان بها قسم آداب اللغة العربية.

(ب) إنشاء كليتين شرقيتين في آكره ودهلي.

(ت) طباعة ونشر الكتب العربية على مستوى كبير.

(ث) توظيف علماء اللغات الشرقية لكي يترجموا الكتب الإنجليزية المفيدة إلى اللغات الكلاسيكية الشرقية التي من أهمها العربية.[15]

وبعد سنوات واجهت اللجنة معارضة شديدة من جانب علماء التعليم الذين يرفعون هتاف "تأنجلزة النظام التعليمي" في الهند، فلم يزل ذلك الشغب يزيد ويشتد حتى لم تجد اللجنة بدا إلا أن أعلنت ببدء تدريس اللغة الإنجليزية أيضا ولو

تدريجا. وحتى سنة 1833م كان تدريس اللغة الإنجليزية قد ابتدأ في مدرسة كولكتا وكلية آكره، كما أنشئت "مدارس المحافظة الإنجليزية" في دهلي وبنارس.[16]

أما الأقاليم الأخرى، فلم تكن تشاهد مثل هذه الصراعات خلال تلك المرحلة. فمثلا في بومبائ كل ما هناك من مشاجرة ومصارعة ومناقشة، كان بين اللغة الإنجليزية ولغة الأم، لا اللغة العربية.

وبعد سنة 1834م، حين ما زار اللورد ميكالى (1800م–1859م) الهند، ومكث هناك لخمس سنوات، بلغ النزاع المرير بين علماء التعليم والمثقفين على قضية أخذ وسيلة التعليم للطلاب الهنديين على أشده حيث انقسمت "اللجنة العامة للمعارف" في فرقتين، الفرقة الأولى، وهي خمسة أعضاء، تقال لها "الفرقة الشرقية"، ويترأسها أيتش– تي– بيرنسب سكرتير التعليم في البنغال. أما الفرقة الثانية، فهي التي تقال لها "الفرقة الإنجليزية"، وكانوا أيضا خمسة رجال أخذ زعامتهم اللورد ميكالى الذي كان رئيس اللجنة العامة بالإضافة إلى كونه عضوا في "المجلس التنفيذي للحاكم العام".[17]

إذ أن اللجنة العامة كانت قد افترقت في فرقتين متساويتين بحيث لا يمكن لإحداهما أن تكون لها أغلبية لفرض رأيها على الآخرين، توفقت عملية التشاور والتحاور حتى أحالوا كلهم قضيتهم إلى الحاكم العام الذي اختار رأي الفرقة الإنجليزية.[18]

أما آراء كلا الفرقتين، فنلخصها فيما تحت:

رأي الفرقة الشرقية:

يمكن أن نلخص رأي هذه الفريق في نقاط تالية:

1. إن من واجبات الحكومة، وفق قانون سنة 1833م الدستوري، أن تنفق ألف مئة روبية سنويا على إحياء وتطوير الأدب وطباعة كتبه. وهل المراد به إلا أدب المسلمين والهنادكة.
2. إن تقديم مواد العلوم الطبيعية والتكنولوجية في اللغات الأوروبية لا يقبله الهنديون، المسلمون والهنادكة على السواء، فيجب أن ذلك التقديم في "لغاتهم القديمة" التي يحترمونها.

3. يجب الحفاظ على معاهد العلوم الشرقية مثل مدرسة كولكتا، فاقتراح إغلاق هذه المعاهد، كما ترى الفرقة الإنجليزية، لا يوافق الخطة الحكومية بتأليف القلوب، كما أنه يخلق العنف في المجتمع.
4. إن الهنديين، المسلمين والهنادكة، ينظرون إلى اللغة الإنجليزية نظرة تعصب وعداء، فلا يتقنونها أبدا. فإذا ما فرضت هذه اللغة عليهم قسرا، فلا يحدث ذلك إلا اضطرابا وقلقا.
5. يجب على الحكومة أن تعلّم المحليين في لغة تلائم ذوقهم. فالسكان المحليون لا يستمتعون إلا بأن يتحصلوا على التعليم في لغتهم أنفسهم، العربية والسنسكريتية.
6. إن اللغتين العربية والسنسكريتية هما لغتا الأصول الشرعية والدراسات المذهبية. فإخراج هاتين اللغتين من النظام التعليمي بمثابة حرمان الشعبين، المسلم والهندوكي، من شريعتهم وديانتهم.[19]

رأي الفرقة الإنجليزية:

تمثل رأي هذه الفريق في اقتراحات قدمها اللورد ميكالى في شهر فبراير سنة 1835م بصدد تشكيل الخطة التعليمية الجديدة. وهذه الوثيقة التي يقال لها "محضر ميكالى" (Macaulay's Minute) تحتل مكانة عظيمة في تأريخ التعليم شبه القاري.

وما قدمه اللورد ميكالى من اقتراحات، يمكن تلخيصها في نقاط آتية:

1. إن لفظة "الأدب" المستخدمة في قانون سنة 1813م الدستوري يمكن إطلاقها على "الأدب الإنجليزي" أيضا.
2. إن تدريس العلوم الطبيعية والتكنولوجية لا يمكن إلا بأن يكون في اللغة الإنجليزية لا غير.
3. إن من واجبات الحكومة أن تغلق معاهد العلوم الشرقية لعدم فائدتها ومنفعتها.
4. إن اللغة الإنجليزية كوسيلة التعليم أفضل من اللغة العربية واللغة السنسكريتية، فعنده:

- " a single shelf of a good European library was worth the whole native literature of India and Arabia"[20]

(رف كتب في المكتبة الأوروبية الجيدة يساوي جميع الأدب المحلي في الهند و(الجزيرة) العربية.)

5. وما يزعم من أن المحليين ينظرون إلى اللغة الإنجليزية نظرة عداء وتعصب، بعيد عن الحقيقة. بل الألأمر عكس ذلك، فالهنديون لهم ولوع شديد باللغة الإنجليزية. ودليل ذلك عنده:

> "During the last three years, about sixty thousand rupees have been expended in this manner. The sale of Arabic and Sanskrit books, during those three years, has not yielded quite one thousand rupees. In the mean time, the School-book Society is selling seven or eight thousand English volumes every year, and not only pays the expenses of the printing, but realizes a profit of 20 per cent on its outlay."[21]

(إن الكتب العربية والسنسكريتية التي طبعت بستين ألف روبية خلال ثلاث سنوات ماضية ما جلبت، خلال تلك المدة، إلا ألف روبية فقط، بينما تبيع "جمعية الكتب المدرسية" سبعة أو ثمانية آلاف كتب إنجليزية سنويا.)

6. أما كون كتب الأصول الشرعية والدراسات المذهبية في اللغتين العربية والسنسكريتية، فيمكن الخروج عن تلك المشكلة بترجمة تلك الكتب إلى الإنجليزية.

واستنتج اللورد ميكالى في آخر تقريره الشهير قائلا:

" ….. we are free to employ our funds as we choose; that we ought to employ them in teaching what is best worth knowing; that English is better worth knowing than Sanskrit or Arabic; that the natives are desirous to be taught English, and are not desirous to be taught Sanskrit or Arabic; that neither as the language of law, nor as the languages of religions, have the Sanskrit and Arabic any peculiar claim to our engagement; that it is possible to make natives of this country thoroughly good English scholars, and that to this end our efforts ought to be directed. In one point I fully agree with the gentlemen to whose general views I am opposed. I feel with them, that it is impossible for us, with our limited means, to attempt to educate the body of the people. We must at present do our best to form a class who may be interpreters between us and the millions

whom we govern; a class of persons, Indian in blood and colour, but English in taste, in opinions, in morals, and in intellect. To that class we may leave it to refine the vernacular dialects of the country, to enrich those dialects with terms of science borrowed from the western nomenclature, and to render them by degrees vehicles for conveying knowledge to the great mass of the population.[22]

(أظن أنه قد اتضح أننا أحرار في أن نصرف صنادقنا كما نشاء، وأنه يجب بنا أن ننفقها في تدريس ما هو جدير بالمعرفة فقط، وأن اللغة الإنجليزية أكثر جدارة بالمعرفة من اللغة السنسكريتية أو العربية، وأن المحليين يشتاقون إلى دراسة اللغة الإنجليزية، لا السنسكريتية ولا العربية، وأن السنسكريتية والعربية، كلغتى القانون والدين، لا تستحقان اهتمامنا، وأنه قد صار في وسعنا أن نجعل المحليين يعرفون الإنجليزية، وإلى ذلك الهدف علينا ان نوجه مساعينا. أتفق تماما بالسادة – الذين أعارضهم في آرائهم العامة – في نقطة وحيدة، وهي أنه صار من المستحيل أن نحاول تعليم عامة الناس بوسائلنا المحدودة. لكن، في وضعنا الراهن، يجب أن نحاول ما في وسعنا بأن ننشئ طبقة تعمل كترجمان بيننا وبين ملايين الناس الذين نحكمهم، تكون هندية في الدم واللون، إنجليزية في التذوق والأفكار والأخلاق والعقل، تهذب اللهجات المحلية وتخصبها بالمصطلحات العلمية المستوردة من الغرب، وتجعلها تدريجيا أدوات النقل السليمة لإبلاغ المعرفة إلى مجموعة كبيرة من السكان.)

وما إن قدم اللورد ميكالى اقتراحاته هذه حتى نالت القبول من الحاكم العام اللورد وليام بينتينك (William Bentink) في نفس السنة، وصارت حجرا أساسيا للخطط التعليمية القادمة.

ومن الصواب أن يقال بأن قبول الاقتراحات الميكالية من قبل الحكومة الاستعمارية في الهند برز كحادثة فاجعة في تأريخ اللغة العربية في شبه القارة، إذ أن اللغة الإنجليزية، منذ ذاك الوقت، جعلت تسيطر آفاق النظام التعليمي العام كما تقهقرت اللغة العربية، وتقلص مدى تأثيرها في جوانب المجتمع الهندي.

لكن، على كل حال، ليس بصحيح أن يقال بأن نزاع وسيلة التعليم انتهى بعد تقديم ثم قبول الخطة الميكالية، بل ما زال يهب رأسه مرة بعد مرة لخمس سنوات

حتى سنة 1839م، وذلك في دور اللورد آكلاند (Lord Aukland) الذي قضى عليه للأبد بعد أن قدم محضره في شهر نوفمبر من تلك السنة محللا أسباب الخلاف ومقترحا حلوله، كما عين مبالغ ضخمة ليطمئن بها كلا الفريقين. فمن جانب، حدد 31000 روبية سنويا للمعارف الشرقية يضمن بها:

- إبقاء معاهد المعارف الشرقية ودفع المصروفات الوافية والمنح الكافية للأساتذة والطلاب
- التشجيع على إعداد وطباعة الكتب المفيدة في اللغات الشرقية من بينها العربية
- ترجيح تدريس المعارف الشرقية على الدراسات الإنجليزية في تلك المعاهد

ومن جانب آخر، وضع ألف مئة روبية سنويا لتدريس الأدب والفلسفة والمعارف الإنجليزية. وبهذا نجح اللورد آكلاند في إنقاذ اللغة العربية من الانمحاء التام، كما دعم كثيرا لنشر التعليم الإنجليزي. ولم تزل هذه الفكرة حجرا أساسيا لمعظم الخطط التعليمية الرسمية في سنوات قادمة.[23]

المرحلة الثالثة من سنة 1854م إلى سنة 1902م:

امتازت هذه المرحلة بسمات عديدة، وهي:

أولا، ابتدأت هذه المرحلة بإنشاء أقسام تعليمية رسمية بعد أن وقع جميع شبه القارة الهندية الباكستانية تحت الحكم البريطاني المباشر إثر إحباط "ثورة 1857م" الشهيرة.

ثانيا، نجح علماء التعليم الإنجليز في إحداث نظام تعليمي يستهدف إلى نشر آداب وعلوم غربية باستخدام اللغة الإنجليزية كوسيلة التعليم في جميع المراحل التعليمية ما عدا الثانوية الأولى حيث كانت اللغة الإنجليزية تدرّس كمادة مدرسية فقط.[24]

ثالثا، ظهرت تغيرات واضحة في الفكر الغربي حول الديانات والآداب والفلسفة الشرقية. فقبل سنة 1813م، كان الرجل الإنجليزي العادي يعتقد، على أساس الدعوات التبشيرية، بأن جميع الديانات الشرقية أكاذيب كما أن كل الآداب في اللغات الشرقية الكلاسيكية عديمة الفائدة، لكن بعد جهود البريطانيين، وارن هاستنغ (Warren Hasting)، ومنتو (Minto)، وولسون (Wilson)، وبرنسب

(Prinsep) وغيرهم، الجبارة، جعلت هذه الآداب تجذب أنظار التفات وإعجاب.[25]

رابعا، أنشئت خمس جامعات جديدة، على طراز جامعة لندن، في كولكتا، وبومبائي، ومدراس، وإله آباد، ولاهور. أسست جامعة بومبائي، وجامعة كولكتا، وجامعة مدراس في سنة 1857م. وكان من أهداف إنشاءها " منح الشهادات، بوسيلة عقد الاختبارات، لمن له براعة في مجالات متنوعة من الأدب والعلم والفن".[26] أما جامعة بنجاب التي أنشئت في سنة 1882م، فاتسمت بأن لديها " عمادة الدراسات الشرقية" والتي تمنح الشهادات والألقاب الأدبية لمن حصل على النجاح في الاختبارات التي عقدت في اللغات العربية والفارسية والسنسكريتية.[27]

خامسا، تضخم عدد الكليات أيضا في هذه المرحلة. تشير الإحصائيات إلى أن عدد الكليات في شبه القارة حتى سنة 1882م قد بلغ 72 كلية، و11 منها كليات شرقية.[28] الثلاثة منها جديرة بالذكر هنا، وهي:

1. كلية كينغ (King):

أسست هذه الكلية في لكهنو، سنة 1864م، باسم الحاكم العام اللورد كينغ. وفي سنة 1882م كان لها حرمان، الحرم الإنجليزي، والحرم الشرقي الذي التحق بجامعة بنجاب في لاهور والذي تحول فيما بعد إلى "جامعة لكهنو" الحالية.

2. الكلية المحمدية الإنجليزية – الشرقية:

كان إنشاء هذه الكلية في علي كرهـ، سنة 1875م، نتيجة المساعي الجليلة التي قام بها السر سيد أحمد خان. وبعد سنوات من التأسيس ترقت هذه الكلية إلى درجة " جامعة علي كرهـ الإسلامية".

3. الكلية الشرقية:

أنشئت هذه الكلية في سنة 1870م بلاهور، وتحولت أخيرا إلى " جامعة بنجاب". امتازت الكلية من غيرها من الكليات الشرقية والإنجليزية الأخرى في أنها، بالإضافة إلى إسهامها في تعليم اللغات الشرقية وخاصة العربية، كانت تنظم تعليم العلوم والمعارف الأوروبية بوسيلة اللغات

الهندية الحديثة. ولأجل ذلك، طبع هذا المعهد الترجمات الهندية والأردية للأعمال الأوروبية على موضوعات متنوعة مثل الرياضيات، والعلوم الطبيعية، والحيوية، والكيماوية، والمنطق، والجغرافيا وغيرها.[29]

سادسا، إن أول محاولة جادة، على جانب الحكومة الاستعمارية، لتعليم الأطفال المسلمين خاصة في شبه القارة على المستوى المدارس والكليات ظهرت في هذه المرحلة. وذلك أن حكومة شركة الهند الشرقية تغافلت عن واجباتها في مجال تعليم المسلمين. لكن حينما عين اللورد مايو (Moyo) حاكما عاما لشبه القارة، لفت نظره، في سنة 1871م، إلى تعليم المسلمين الذين كانوا لا يثقون ثقة تامة بالنظام التربوي الجديد، فأمر " بتشجيع تدريس لغات المسلمين الكلاسيكية (منها العربية) والمحلية في جميع المدارس والكليات".[30]

فبناء على ذلك، أخذت " جامعة مدراس " اللغة العربية كمادة اختيارية من مواد الاختبارات، كما عينت " جامعة بومبائي " أستاذا في اللغة العربية في " كلية إلفنستون"، كما أنشئت ثلاث مدارس شرقية في داكا، وراج شاهيا، وتشيتا غونغ تحت إشراف "المولويين" الأفاضل.[31]

المرحلة الرابعة من سنة 1902م إلى سنة 1921م:

كانت هذه المرحلة مرحلة ذات أهمية بالغة لمسلمي شبه القارة إذ أن فيها قد قام المسلمون بطلب حقوقهم الخاصة في إطار الدستور الهندي، ورفعوا هتاف " القومية المسلمة " بعد أن أنشأوا حزبهم السياسي باسم "مسلم ليغ " (الرابطة الإسلامية) في سنة 1905م. ثم ما زادهم وعيا سياسيا ونهوضا فكريا هو أن قسم الإنجليز إقليمهم البنغال في قسمين، الشرقي والغربي، مما جعلهم أقلية مقبل الهنادكة، كما ابتدأت "حركة الخلافة " خلال هذه المدة بعد أن قضى الاستعمار على الخلافة العثمانية في تركيا.[32]

أما في المجال التعليمي، فقد أخذ المسلمون يظهرون عدم رضاهم بكمّ وكيفية الكليات والمدارس للمسلمين في شبه القارة لأسباب أهمها غياب التعليم الديني للمسلمين، وعدم احتفال مناسباتهم الثقافية والدينية في المدارس والكليات، وعدم استخدام لغتهم الأردية كوسيلة التعليم لهم، وقلة عدد الأساتذة في

المؤسسات الرسمية التعليمية، وفوق ذلك كله عدم توفير تسهيلات كافية لدراسة اللغتين، العربية أو الفارسية.[33]

وبالنظر إلى القلق والاضطراب في الأقلية المسلمة، أنشئت، في هذه المرحلة، معاهد تعليمية خاصة للمسلمين يمكن تقسيمها في ثلاث مجموعات. المجموعة الأولى تشتمل على المعاهد التي أخذت منهجها الدراسي محدودا في حقل واحد وهي تعليم الدين والخصائص الإسلامية. وكانت هذه المجموعة، في الحقيقة، على ثلاثة أنواع:

النوع الأول: المكاتب، كان هذا النوع معروفا في أقاليم البنغال، و يو– بي (الإقليم المتحد)، والبنجاب، وارتفع عدده، حتى سنة 1916م، إلى 6548 مكتبا يرشد آلافا من الطلاب.

النوع الثاني: مدارس ملاّ، أقيمت هذه المدارس في السند والتي تدرب "المولويين" (أئمة المساجد ومعلمي القرآن الشريف) الذين يأتون إليها في مئات لدورة ثلاثة شهور فقط.

النوع الثالث: مدارس القرآن، كانت هذه المدارس تنتشر في كل حدب وصوب من شبه القارة، وتمنح التعليم تحت أهداف دينية. وقامت الحكومة الاستعمارية بتقديم مشروع تحوّلها إلى مدارس ابتدائية.

والمجموعة الثانية تشتمل على معاهد لدراسات خاصة، وتسمى في العرف العام بـــ "المدارس الدينية" والتي كانت مبعثرة في جميع أنحاء شبه القارة الهندية، وما زالت الحكومة تحاول بأن تدع هذه المدارس تدير أمورها التعليمية والإدارية حسب متطلبات العصر الراهن.

والمجموعة الثالثة التي تفوق المجموعتين السابقتين أهمية ومكانة تشتمل على المدارس والكليات والجامعات الحديثة التي أنشئت من قبل الحكومة أو المؤسسات الإسلامية الأهلية. وكانت معاهد هذه المجموعة توفر فرص تعليم اللغة العربية والفارسية والأردية بالإضافة إلى الدراسات الإسلامية على أيدي الأساتذة المسلمين. تضم هذه المجموعة جامعة علي كره، وجامعة داكا، وعدد غير قليل من

الكليات مثل الكلية الإسلامية بلاهور، والمدارس الثانوية والابتدائية المنتشرة في جميع أطراف شبه القارة الهندية والباكستانية.[34]

ثم ما يميز هذه المرحلة من وجهة أخرى هو أنه قد زاد عدد الجامعات من 5 إلى 12 جامعة. أما الجامعات التي أنشئت في هذه المرحلة، فهي:

1. جامعة ميسور، أنشئت هذه الجامعة في سنة 1916م في قطاع رسمي، وقللت من أعباء جامعة مدارس.
2. جامعة بتنه، أنشئت في سنة 1917م لإقليم بهار وأوريسا.
3. جامعة بنارس، بدأت هذه الجامعة عملها في سنة 1917م، وتعرف باسم "جامعة بنارس الهندوكية".
4. جامعة علي كره، أنشئت هذه الجامعة في مدينة علي كره في سنة 1920م على آثار "الكلية المحمدية الإنجليزية– الشرقية" التي أنشأها الزعيم السياسي المسلم السرالسيد أحمد خان.
5. جامعة داكا، أنشئت في داكا سنة 1920م لتعليم المسلمين في البنغال وآسام.
6. جامعة لكهنو، أنشئت في مدينة لكهنو في سنة 1920م على طراز جامعة داكا.
7. الجامعة العثمانية، أنشأها رئيس دولة حيدرآباد الدكن معالي النظام في سنة 1918م. وتتميز هذه الجامعة من الجامعات الأخرى بأن وسيلة التعليم في هذه الجامعة هي اللغة الأردية لا الإنجليزية.[35]

المرحلة الخامسة من سنة 1921م إلى سنة 1937م:

ابتدأت هذه المرحلة ببدء نظام حكومي جديد يسمى بـــ "النظام المزدوج" حيث تنقسم الوزارات في قسمين: الوزارات المحتجزة التي تحال إليها المسئولية من قبل الحاكم الإقليمي مباشرة، والوزارات المتنقلة التي تحمل مسئوليتها من قبل المجلس التشريعي، وعندما أحدث هذا النظام مشاكل عديدة غير منحلّة في إدارة الحكومة بطريق جيد، تبدل بنظام "الاستقلال الإقليمي".

وعلاوة على ذلك، شاهدت هذه السنوات نوعا جديدا من الوعي الوطني في المجال الاجتماعي والسياسي تمثل في بدء حركتين سياسيتين شاملتين، "حركة عدم التعاون"، و"حركة العصيان المدني"، ضد الحكومة الإنجليزية عبر شبه القارة بالإضافة إلى مقاطعات وتظاهرات تشريعية كثيرة.[36]

ومن سمات هذه المرحلة التي تهمنا هنا أنه:

أولا، قد أنشئت خمس جامعات جديدة، وهي:

1. جامعة دهلي، أنشئت في سنة 1922م.
2. جامعة ناغبور، أنشئت في سنة 1923م.
3. جامعة آندهرا، أنشئت في سنة 1926م.
4. جامعة آكره، أنشئت في سنة 1927م.
5. جامعة أنّا ملائي(Annamalai)، أنشئت في سنة 1929م.[37]

كما فتحت أقسام وكليات جديدة في الجامعات الأخرى، فمثلا أقيم في جامعة مدراس " معهد الدراسات الشرقية" الذي كان يشتمل على أقسام تقوم بالبحث في اللغات، السنسكريتية، والعربية، والفارسية، والأردية وما إلى ذلك.[38]

ومن الجامعات التي قد زاد عددها من 12 في سنة 1921م إلى 17 في سنة 1937م، تضم الثمانية منها عمادات اللغات الشرقية، وهي دامعة كولكتا، وجامعة بومبائي، وجامعة مدراس، وجامعة بنجاب، وجامعة بنارس، وجامعة لكهنو، وجامعة آندهرا، وجامعة أناملائي.[39]

ثانيا، قررت االلغات الهندية، من بينها الأردية التي تحمل عددا غير قليل من المفردات العربية، كوسيلة التعليم في المواد التعليمية إلا مادتى اللغة الإنجليزية والرياضيات بدل اللغة الإنجليزية على مستوى الثانوية.[40]

ثالثا، قد كثر اهتمام المسلمين إلى تعليم أبناءهم وبناتهم خلال ذلك الحين، حتى قيل إن نسبة الطلاب المسلمين المسجلين في مختلف المعاهد التعليمية أكثر بكثير من النسبة للأقوام الأخرى في شبه القارة.[41] وكل هذا يرجع إلى اليقظة السياسية والاجتماعية للمسلمين في القرن العشرين.

أما نوعية معاهد المسلمين، فمنها ما كانت تسمى "معاهد مستقلة"، وكانت على ثلاثة أقسام، الكليات وكان عددها 9 كليات، والمدارس الثانوية وكان عددها 182 مدرسة، والمدارس الابتدائية أو المدارس الإسلامية وكان عددها 6648 مدرسة. ومنها ما كانت تسمى "معاهد خاصة"، وكانت أيضا على ثلاثة أقسام، المدارس وكان عددها 548 مدرسة، والمكاتب وكان عددها 25859 مكتبا، والمدارس القرآنية وكان عددها 827 مدرسة. إذن كان عدد جميع المعاهد التعليمية، المعترفة وغير المعترفة بها، للمسلمين 37141 معهدا.[42]

المرحلة السادسة من سنة 1937م إلى سنة 1947م:

ابتدأت هذه المرحلة باستبدال النظام المزدوج السابق بنظام جديد، وهو نظام " الحكم الذاتي الإقليمي " الذي قامت بتطبيقه الحكومة الاستعمارية في سنة 1937م، والذي كان يؤمل منه بأن يقضي على جميع النقائص التي دخلت في النظام التعليمي من أجل "الازدواجية" السابقة.

لكن ما حدث من تطورات لاحقة، فليس على ما يرام. النزاعات الداخلية مثل الصراع الثلاثي بين كونغرس، ومسلم ليغ، وحكومة الاستعمار، والفتن الخارجية مثل نشوب الحرب العالمية الثانية في سنة 1939م، لم تدع أية حكومة إقليمية أن تؤدي مسؤلياتها في الحقل التعليمي حق أدائها.

ومن سمات هذه المرحلة:

أولا، أنشئت أربع جامعات جديدة، وهي:

1. جامعة دولة تراونكور، أقيمت في سنة 1937م. ومن خصائصها أنه قد فتحت فيها مكتبة خاصة للمخطوطات الشرقية.
2. جامعة أوتكال، أنشئت في سنة 1943م.
3. جامعة سوغور، أنشئت في سنة 1946م.
4. جامعة راجبوتانه، أنشئت في سنة 1947م.[43]

أما مستوى التعليم في المسلمين، فقد رأى تقدما نسبيا على المستوى الابتدائي والثانوي لا الجامعي خلال هذه المدة. ثم، في نفس المدة، ظهر تقرير من لجنة خاصة على تعليم المسلمين التي عينها " مؤتمر المسلمين التعليمي عبر الهند". ومن

الاقتراحات المقدمة من قبلها والتي تشجع، مباشرة أو غير مباشرة، على تعليم اللغة العربية، يهم بالذكر هنا:

1. الديانة تجب أن تتشكل أساسا لتعليم المسلمين.
2. اللغة الأردية تجب أن تجعل وسيلة التعليم للمسلمين.
3. يجب أن يعدّ منهج خاص للمدارس الابتدائية للمسلمين.[44]

رجال اللغة العربية في مخيّم الاستعمار الإنجليزي:

1. لومسدون

ولد هذا المستشرق الكبير في سنة 1777م. بعثه شركة الهند الشرقية إلى الهند في سنة 1794م حيث تعلم اللغة العربية واللغة الفارسية، ثم جعل يدرّس في كلية كولكتا كما نظم "مطبعة كولكتا"، ونشر منها القاموس للفيروزآبادي، والمقامات للحريري، ومختصر المعاني للقزويني، وشرحا عربيا للمعلقات بالإضافة إلى مخطوطات عربية رائعة. ومن مؤلفاته كتاب إنجليزي في القواعد العربية. توفي في إنجلترا سنة 1835م.[45]

2. غل كرست (John Gilchrist)

ولد هذا العالم الكبير في سنة 1759م في إسكلنده، ودخل الهند سنة 1782م حينما وجد الوظيفة في شركة الهند الشرقية. وبعد مجيئه في الهند، تعلم لغات منطوقة في شبه القارة لكى يخدم الحكومة الاستعمارية بمواهبه في هذا المجال. غادر شبه القارة في سنة 1804م، وتوفي في باريس سنة 1841م.[46]

ومن مطبوعاته Hindi Arabic Mirror (مرآة العربية الهندية). طبع في سنة 1804م، ويحتوي على ألفاظ عربية يجب معرفتها لمن يريد أن يتعلم اللغة الهندية\ الأردية.[47]

3. جان بيلي (John Bellie)

عين أستاذا في كلية فورت وليام سنة 1801م براتب ألف وست مئة روبية شهريا. وبالإضافة إلى ذلك، كان يقوم بعمل ترجمة الكتب العربية إلى اللغات المحلية.[48]

4. الدكتور جي. دبليو. لائتنر (Dr. G. W. Leitner)

ولد الدكتور لائتنر، مؤسس الكلية الشرقية، سنة 1840م في مدينة بودابست (Budapest) في بلاد مجرة (Hungry). وبعد الحصول على العلوم، عين أستاذ اللغة والآداب العربية والقانون الإسلامي في كلية كنكز في سنة 1861م، كما أنتخب عضوا للجمعية الآسيوية الملكية. وعند ما أنشئت الكلية الحكومية بلاهور سنة 1864م، عين أول رئيس للكلية. وفي سنة 1870م، عين أول رئيس للكلية الشرقية كما أصبح أول مسجل لجامعة بنجاب في سنة 1882م. ترك وظيفته هذه في سنة 1886م، وانتقل إلى أوروبا حيث مات في ألمانيا سنة 1899م.[49]

يقول عنه الدكتور ظهور أحمد أظهر:

" امتاز شخصية لائتنر عن غيره من العلماء الإنجليز بأنه كان حريصا دائما على إحياء المعارف الشرقية. كان يولي اهتمامه الخاص برجال الدين المسلمين الذين يقومون بخدمة اللغة العربية وعلومها وآدابها في منطقة بنجاب، وأتت مساعيه مثمرة مفيدة حين أنشئت الكلية الشرقية سنة 1870م."[50]

ومن كتبه التي تتعلق بالعلوم العربية:

1. مقدمة النحو العربي الفلسفي

   قد طبع الكتاب من بشاور سنة 1991م بتحقيق الدكتور ظهور أحمد أظهر.

2. سنين الإسلام (في جزءين)

   وهذا الكتاب في تأريخ العرب وآدابهم.[51]

5. السر تامس دبليو. آرنلد (Sir Thomas W. Arnold)

ولد في مدينة ديون بورت (Devon Port) بإنجلترا سنة 1864م. وبعد الحصول على المعارف الشرقية وخاصة اللغات الفارسية والعربية والسنسكريتية، التحق بكلية علي كرهـ كأستاذ في سنة 1888م. وفي سنة 1898م، عين أستاذ الفلسفة في الكلية الحكومية بلاهور، ثم أصبح عميدها فيما بعد. وخلال مكثه في الكلية الحكومية، عمل كرئيس الكلية

الشرقية المؤقت لمرتين. وفي سنة 1904م، توجه إلى لندن، وعين أستاذ الأدب العربي في كلية جامعة لندن، ومازال يخدم الدراسات الشرقية حتى وفاته في سنة 1930م.[52]

6. فوستر آربوثنات (Forster Fitzgerald Arbuthnot)

ولد هذا العالم الجليل في سنة 1833م. خدم الحكومة الإنجليزية في الهند كـــ "جامع الضرائب". كان مترجما رائعا وأسهم في ترجمة عديد من الكتب العربية إلى الإنجليزية. توفي سنة 1901م، وكان له كتاب في الإنجليزية: Arabic Authors: A Manual of Arabian History and Literature.[53]

7. ريتشارد فرانسيس بارتن (Richard Francis Burton)

ولد في سنة 1821م، وانتقل إلى شبه القارة في سنة 1842كملازم أول في الجيش الإنجليزي. وهناك أخذ مظهر المسلمين كما جعل يزور بلاد العرب، وكان له إلمام باللغة العربية. أما إسهامه في خدمة اللغة العربية، فهو ترجمته الشهيرة لكتاب " ألف ليلة وليلة " في اللغة الإنجليزية، كما ترجم في الإنجليزية كتاب " قصيدة الحاج عبده اليزدي " باسم: A Lay of Higher Law توفي في سنة 1890م.[54]

8. ناثانيال براسي هالهيد (Nathaniel Brassey Halhed)

ولد هذا المستشرق وفقيه اللغة في سنة 1751م في " ويست مانستر "، ودرس اللغة العربية في جامعة آكسفورد. وبعد الحصول على وظيفة عمل الكتابة في شركة الهند الشرقية، ذهب إلى الهند، وعمل كمترجم الكتب الفارسية والسنسكريتية إلى الإنجليزية. ويقال أنه أول عالم اهتم إلى دراسة علاقة لغوية بين السنسكريتية واللغات الأخرى، العربية والفارسية والإغريقية واللاتينية. توفي في سنة 1830م.[55]

9. وليام جيفارد بالغراف(William Gifford Palgrave)

ولد في إنجلترا سنة 1826م. وبعد تخرجه في جامعة آكسفورد حيث قرأ اللغة العربية التحق بالجيش البريطاني، ثم زار البلدان العربية مثل سوريا،

والنجد، والبحرين، وعمان، وأتقن اللغة العربية هناك. تةفي في سنة 1888م.[56]

ب – أوضاع اللغة العربية في القطاع الأهلي تحت حكم الإنجليز

إن الفترة التي تلت الثورة ضد الإنجليز سنة 1857م كانت فترة أزمات، سياسية كانت أو اقتصادية، اجتماعية كانت أو دينية، وبليات للمسلمين الذين أخرجوا من ديارهم وأموالهم، وهدمت شعائر دينهم كما أغلقت مراكز علوهم، لكن سرعان ما انتبه المفكرون المخلصون منهم، وركزوا جهودهم الجبارة في إنقاذ الهوية الإسلامية من براثن الاستعمار، بالإضافة إلى إقامة الشعب المسلم على أقدامه في المجتمع المغلوب.

أما اللغة العربية في القطاع غير الرسمي خلال تلك المدة، فبدأت تنمو من بعض النواحي رغم ضغوط الاستعمار الإنجليزي القاهر، ، وذلك عكس مانالت الدراسات الفارسية من تخلف بارز. وكان لهذا المظهر الغريب سبب كبير، وهو أن المسلمين، كرد فعل إزاء الحكم الأجنبي الذي بدأ ينشر لغته الإنجليزية، ازدادوا تمسكا باللغة العربية وآدابها، والعلوم الدينية ، ففتحت المدارس العربية في جميع أنحاء شبه القارة الهندية والباكستانية، كما أكب علماء العربية المحليين على ترويج الدراسات العربية، فألفوا كتبا غير معدودة، وأصدروا مجلات وجرائد في شتى مجالات العلم والمعرفة.

إنشاء مدارس عربية دينية في الحكم الإنجليزي:

أنشئ، خلال هذه المدة، في شبه القارة عدد كبير من المدارس والمعاهد العربية والدينية. وكانت تلك المدارس والمعاهد يتبع منهجا خاصا للتعليم، يعرف بـــ "المنهج النظامي" الذي يمتاز بعنايته الفائقة بتدريس اللغة العربية وآدابها، كما أنها تعمل لأهداف مشتركة وهي: دراسة العلوم الإسلامية العربية مثل التفسير والحديث، والاهتمام بتعليم اللغة العربية وآدابها، والرد على أعداء الإسلام بالإضافة إلى محاربة البدع والخرافات المنتشرة في المجتمع الإسلامي الهندي.[57]

ومن المدارس العربية الدينية التي أنشئت خلال هذا العصر، نخص بالذكر:

مدرسة الإصلاح:

أسست هذه المدرسة في سنة 1909م تحت إشراف " جمعية إصلاح المسلمين " التي أسسها الشيخ محمد شفيع. كان هذه المدرسة في بداية أمرها تحذو حذو المدارس الأخرى، لكن حينما اقترح الشيخ عبد الحميد الفراهي تعديلات في مناهجها الدراسية القديمة بحيث أكد على اهتمام كبير بالأدب العربي ولغته، جعلت تجذب طلابا كثيرين من أقاصي البلاد. وكان من الذين تخرجوا بهذه المدرسة العلامة أمين أحسن إصلاحي صاحب التفسير الشهير " تدبر قرآن" بالأردية.[58]

2.مدرسة ندوة العلماء:

أسست هذه المدرسة في سنة 1316 الهجرية بمدينة لكهنو على أساس الجمع بين القديم الصالح والجديد النافع من أمور التعليم والمعرفة في اختيار مناهج الدراسة. وتتميز مناهج الدراسة التعليمية بأن لغة التدريس في جميع المراحل وخاصة المراحل العليا هي اللغة العربية.[59]

1. مدرسة دار العلوم:

أنشئت هذه المدرسة في شمالى دهلي ببلدة ديوبند قرب مدينة سهارنبور. أسسها الشيخ محمد قاسم النانوتوي في سنة 1867م. وما مضى وقت طويل حتى جعلت تعد من أكبر المدارس العربية الدينية، وتسمى بـــ " أزهر الهند ".[60] وكانت العلوم الإسلامية بالإضافة إلى الأدب العربي تدرس بواسطة اللغة العربية.[61]

مدرسة مظاهر العلوم:

فتحت هذه المدرسة بمدينة سهارنبور في سنة 1283 الهجرية بحماية الشيخ رشيد أحمد الكنكوهي، والشيخ أشرفع علي التهانوي. وكان لهذه المدرسة اهتمام خاص بتعليم اللغة العربية.[62]

وبالإضافة إلى تلك المدارس الجليلة، أنشئت عدة مدارس أخرى، فمثلا بنيت "مدرسة شاهي" بمرادآباد، و "مدرسة إمدادية" في دربهنكا، و "الجامعة السلفية" في بنارس، و "المدرسة الرحمانية" في دهلي. وفي جنوب الهند، أقيمت

"المدرسة النظامية" بحيدرآباد، ومدرسة " جامع دار الهدى" في كريم نكر، ومدرسة "جامعة دار السلام" بعمر آباد، و "المدرسة الجمالية" في مدراس بالإضافة إلى عدة مدارس في مدن هندية أخرى مثل أعظم كرهـــ، وميو، وجونبور، وبهار وغيرها.[63]

ظهور نوابغ اللغة العربية وأعمالهم العلمية:

قد برز عدد كبير من علماء العربية في شبه القارة الذين أنتجو أروع الأعمال العلمية والأدبية في هذا العصر. وفي السطور التالية نذكر، أولا، أهم الأعمال العلمية التي ألفت خلال هذا العصر، ثم نحصي بعضا من الشعراء والعلماء الذين كانت تفتخر بهم هذه الأرض في تلك الحقبة.

فمن المؤلفات التي ظهرت خلال هذه المدة والتي ذكرها الدكتور زبيد أحمد في كتابه الشهير، نذكر معظمها حسب الأقسام الآتية:

(أ) علوم القرآن:

1. جنات النعيم في فضائل القرآن، للشيخ محمد هاشم بن عبد الغفور المتوفى في سنة 1760م.
2. الفوز الكبير في أصول التفسير، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
3. فتح الخبير بما لا بد من حفظه في علم التفسير، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
4. تفسير صغير، للشيخ رستم علي بن علي أصغر القنوجي المتوفى في 1764م.
5. كتاب الخواص لبعض السور والآيات، للشيخ محمد علي بن أبي طالب المتوفى في 1769م.
6. كتاب شجرات النور في شرح آية النور، للشيخ محمد علي بن أبي طالب المتوفى في 1769م.
7. كتاب تجويد القرآن، للشيخ محمد علي بن أبي طالب المتوفى في 1769م.
8. تفسير سورة يونس، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.

9. منح الفيوضات الوافية في ما في سورة الرحمن من الأسرار الإلهية، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
10. تفسير ذوالفقارخاني، للشيخ عبد الباسط القنوجي المتوفى في 1808م.
11. رسالة عجيب البيان في علوم تفسير القرآن، للشيخ عبد الباسط القنوجي المتوفى في 1808م.
12. جواهر القرآن، للشيخين غلام أحمد وسيد علي.
13. تفسير مظهري، للشيخ قاضي ثناء الله المتوفى في 1810م.
14. الكمالين حاشية الجلالين، للشيخ سلام الله الرامبوري المتوفى في 1813م.
15. مقدمة تفسير فتح العزيز للشيخ عبد العزيز بن الشاه ولي الله المتوفى في 1823م.
16. تفسير القرآن، للشيخ محمد أشرف اللكهنوي المتوفى في 1828م.
17. تفسير آية النور، للشيخ الشاه محمد رفيع الدين المتوفى في 1833م.
18. رسالة في تحقيق معني إن شاء الله، للشيخ سيد حسين المتوفى في 1854م.[64]

(ب)علوم الحديث:

1. حجة الله البالغة، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
2. الإرشاد إلى مهمات علم الإسناد، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
3. الأربعين، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
4. الدر الثمين في مبشرات النبي الأمين، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
5. شرح تراجم أبواب البخاري، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
6. تأويل الأحاديث، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
7. المسوى شرح المؤطا، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
8. الفضل المبين في المسلسل من حديث النبي الأمين، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.

9. شمامة العنبر في ما ورد في الهند من سيد البشر، للشيخ غلام علي البلكرامي المتوفى في 1785م.
10. ضوء الدراري شرح صحيح البخاري، للشيخ غلام علي البلكرامي المتوفى في 1785م.
11. رسالة في أحاديث يوم العاشورة، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
12. الأمالي الشيخونية، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
13. مجمع المشائخ، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
14. الأزهار المتناثرة في الأحاديث المتواترة، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
15. در الضرع في حديث أم زرع، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
16. تخريج حديث شيبتني سورة هود، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
17. المواهب الجلية فيما يتعلق بحديث الأولية، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
18. المرقاة العلية في شرح الحديث المسلسل بالأولية، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
19. تخريج حديث نعم الأدام الخل، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
20. العروس المجلية في طرق حديث الأولية، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
21. رسالة في أصول الحديث، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
22. القول الصحيح في مراتب التعديل والتجريح، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.

23. التحبير في الحديث المسلسل بالتكبير، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
24. الأربعين، للشيخ عبد الباسط القنوجي المتوفى في 1810م.
25. شرح دلائل الخيرات، للشيخ عبد الباسط القنوجي المتوفى في 1810م.
26. المحلى شرح المؤطا، للشيخ سلام الله محدث المتوفى في 1813م.
27. رسالة في أصول الحديث، للشيخ سلام الله محدث المتوفى في 1813م.
28. رسالة في تقسيم الحديث، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في 1819م.
29. رسالة فيما يجب حفظه للناظر، للشيخ الشاه عبد العزيز المتوفى في 1823م.
30. عزيز الاقتباس، للشيخ الشاه عبد العزيز المتوفى في 1823م.
31. الأحاديث الموضوعة، للشيخ الشاه عبد العزيز المتوفى في 1823م.
32. تنوير العينين في إثبات رفع اليدين، للشيخ الشاه محمد اسماعيل الدهلوي المتوفى في 1830م.
33. رد الإشراك، للشيخ الشاه محمد اسماعيل الدهلوي المتوفى في 1830م.
34. مدارج الإسناد، للشيخ إرتضى علي خان المتوفى في 1835م.
35. المواهب اللطيفة على مسند أبي حنيفة، للشيخ محمد عابد السندي المتوفى في 1841م.
36. ترتيب مسند الإمام أبي حنيفة، للشيخ محمد عابد السندي المتوفى في 1841م.
37. حصر الشارد، للشيخ محمد عابد السندي المتوفى في 1841م.
38. الوصول إلى أحاديث الرسول، للشيخ محمد عابد السندي المتوفى في 1841م.
39. شرح بلوغ المرام لابن حجر، للشيخ محمد عابد السندي المتوفى في 1841م.

40. الأربعين في فضائل الحج والعمرة، للشيخ أبي سليمان محمد إسحاق المتوفى في **1845**م.[65]

(ج)علوم الفقه:

1. فرائض الإسلام، للشيخ محمد هاشم بن عبد الغفور السندي المتوفى في 1760م.
2. رسالة في وضع اليدين تحت السرة، للشيخ محمد هاشم بن عبد الغفور السندي المتوفى في 1760م.
3. رسالة فاكهة البستان، للشيخ محمد هاشم بن عبد الغفور السندي المتوفى في 1760م.
4. البياض الجامعة في أقوال الفقهاء، للشيخ محمد هاشم بن عبد الغفور السندي المتوفى في 1760م.
5. تنقيح الكلام عن قراءة خلف الإمام، للشيخ محمد هاشم بن عبد الغفور السندي المتوفى في 1760م.
6. عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
7. الإنصاف في بيان سبب الاختلاف، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
8. شرح المنار، للشيخ رستم علي القنوجي المتوفى في 1764م.
9. حاشية على حاشية السيالكوتي على التلويح، للشيخ ملا نور محمد المتوفى في 1780م.
10. نشوة الارتياح في بيان حقيقة الميسر والقداح، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
11. عقود الجواهر المنيفة في أدلة أبي حنيفة، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
12. القول المسموع في الفرق بين الكرع والمكروع، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.

13. كشف الغطا عن الصلاة الوسطى، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
14. الاحتفال بالصوم الستة من شوال، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
15. أمالي أبي حنيفة، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في 1791م.
16. شرح مسلم الثبوت، للشيخ ملا محمد حسن المتوفى في 1794م.
17. بدعة المفتين، للشيخ محمد قاسم المتوفى في 1794م.
18. شرح مختصر الفرائد، للشيخ عبد الباسط القنوجي المتوفى في 1808م.
19. تحفة المشتاق في النكاح والصداق، للشيخ ميرزا حسن المتوفى في 1811م.
20. أساس الأصول، للشيخ سيد دلدار علي المتوفى في 1819م.
21. عماد الإسلام، للشيخ سيد دلدار علي المتوفى في 1819م.
22. السيف الماسح، للشيخ سيد دلدار علي المتوفى في 1819م.
23. شرح باب الصوم من حديقة المتقين، للشيخ سيد دلدار علي المتوفى في 1819م.
24. شرح باب الزكوة من حديقة المتقين، للشيخ سيد دلدار علي المتوفى في 1819م.
25. فواتح الرحموت في شرح مسلم الثبوت، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في 1819م.
26. رسالة الأركان الأربعة، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في 1819م.
27. تنوير المنار شرح المنار، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في 1819م.
28. حاشية على التوضيح والتلويح، للشيخ أمين الله المتوفى في 1837م.
29. حاشية على شرح مسلم الثبوت، للشيخ أمين الله المتوفى في 1837م.

30. الرسالة في أصول الفقه، للشيخ الشاه إسماعيل الدهلوي المتوفى في 1830م.
31. تأويل الأنوار على الدر المختار، للشيخ محمد عابد السندي المتوفى في 1841م.
32. كتاب االتقوى ورسالة الحسنى، للشيخ ملا نور الدين المتوفى في 1853م.
33. نفائس الملكوت شرح مسلم الثبوت، للشيخ ولي الله اللكهنوي المتوفى في 1853م.
34. حاشية على الهداية، للشيخ ولي الله اللكهنوي المتوفى في 1853م.
35. الوجيز الرائق، للشيخ أبي عبد الله حسين المتوفى في 1854م.
36. مناهج التدقيق ومعارج التحقيق، للشيخ أبي عبد الله حسين المتوفى في 1854م.
37. روضة الأحكام، للشيخ أبي عبد الله حسين المتوفى في 1854م.
38. رسالة في أنه هل يجوز للمتبحرين في الاجتهاد أن يعملوا على رأيهم، للشيخ أبي عبد الله حسين المتوفى في 1854م.
39. السعادة الأبدية في تحقيق الدائرة الهندية، للشيخ خادم أحمد المتوفى في 1854م.
40. تعليقات على شرح الوقاية، للشيخ خادم أحمد المتوفى في 1854م.[66]

(د)علوم التصوف والفلسفة والأخلاق:

1. فيوض الحرمين، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
2. القول الجميل في سواء السبيل، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
3. التفهيمات الإلهية، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.

4. الانتباه في سلاسل أولياء الله، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
5. رسالة في مسألة وحدة الوجود، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
6. البدور البازغة، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في 1762م.
7. الفتوحات الأنسية في تحقيقات الرموز الصوفية، للشيخ عليم الله اللاهوري المتوفى في 1762م.
8. نصيحة عباد الله وأمة رسول الله، للشيخ محمد بناه المتوفى في 1766م.
9. مظهر النور، للشيخ قمر الدين المتوفى في1779م.
10. الرسالة في تحقيق الوجود، للشيخ قمر الدين المتوفى في1779م.
11. إتحاف السادات المتقين بشرح إحياء علوم الدين، للشيخ أبو الفيض محمد المتوفى في 1799م.
12. النفحة القدوسية لواسطة بضعة العيدروسية ، للشيخ أبو الفيض محمد المتوفى في 1799م.
13. كشف القناع عن إباحة السماع، للشيخ سلام الله المتوفى في 1813م.
14. شرح الفص النوحي من فصوص الحكم، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في 1819م.
15. رسالة الصغرى، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في 1819م.
16. حاشية على القول الجميل، للشيخ الشاه عبد العزيز المتوفى في 1823م.

17. البنيان المرصوص في شرح فصوص الحكم، للشيخ الخواجه سيد آل أحمد المتوفى في1843م.
18. الرسالة في التصوف، للشيخ الشاه أحمد سعيد المجددي المتوفى في1855م.
19. الفوائد الضابطة في إثبات الرابطة، للشيخ الشاه أحمد سعيد المجددي المتوفى في1855م.
20. الروض المجود في تحقيق الوجود، للشيخ محمد فضل حق الخير آبادي المتوفى في1861م.
21. حديقة الصفا في أسماء المصطفى، للشيخ محمد هاشم المتوفى في1760م.
22. تتميم حاشية الخيالي، للشيخ محمد هاشم المتوفى في1760م.
23. الحاشية على شرح العقائد الجلالي، للشيخ كمال الدين المتوفى في1761م.
24. حجة الله البالغة، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في1762م.
25. العقيدة الحسنة، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في1762م.
26. المقدمة السنية في انتصار الفرقة السنية، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في1762م.
27. شرح رسالة في مسائل واجب تعالى، للشيخ الشاه ولي الله الدهلوي المتوفى في1762م.
28. أنوار الهداية في الفدك والقرطاس، للشيخ محمد أنوارالمتوفى في1778م.
29. حكمة الإشراق إلى كتاب الآفاق، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في1790م.

30. الحاشية على الحاشية الزاهدية على الأمور العامة، للشيخ محمد حسن المتوفى في1794م.
31. عماد الإسلام، للشيخ سيد دلدار علي المتوفى في1819م.
32. كشف النقاب عن عقائد ابن عبد الوهاب، للشيخ سيد دلدار علي المتوفى في1819م.
33. الحاشية على شرح العقائد الدواني، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في1819م.
34. شرح مقامات المبادي، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في1819م.
35. الحاشية على شرح المواقف، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في1819م.
36. إرشاد العباد إلى سبيل الرشاد، للشيخ الشاه محمد اسمعيل المتوفى في1830م.
37. الأوهام عن مسألة الكلام، للشيخ القاضي إرتضى علي المتوفى في1835م.
38. البيعة بيد خليفة الرحمن على مذهب النعمان، للشيخ ملا نور الدين المتوفى في1853م.
39. مناهج التدقيق ومعارج التحقيق، للشيخ سيد حسين المتوفى في1856م.
40. تسويلات الفلاسفة، للشيخ ظهور الحق المتوفى في1862م.
41. الحاشية على الحاشية الزاهدية، للشيخ كمال الدين المتوفى في1761م.
42. شرح سلم العلوم، للشيخ ملا محمد حسن المتوفى في1794م.
43. معارج العلوم، للشيخ ملا محمد حسن المتوفى في1794م.

44. الحاشية على الشمس البازغة، للشيخ ملا محمد حسن المتوفى في1794م.
45. الحاشية على الحاشية الزاهدية القطبية، للشيخ ملا محمد حسن المتوفى في1794م.
46. الدوحة الشامخة في شرح الأصول الراسخة، للشيخ ملا محمد المتوفى في1809م.
47. مرآة الشروح شرح سلم العلوم، للشيخ ملا محمد مبين المتوفى في1810م.
48. الحاشية على حمد الله شرح سلم العلوم، للشيخ حكيم شريف خان المتوفى في1815م.
49. التعليقات على شرح سلم العلوم، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في1819م.
50. الحاشية على المثنات بالتكرار، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في1819م.
51. الحاشية على الصدرا، للشيخ عبد العلي بحر العلوم المتوفى في1819م.
52. تشحيذ الأذهان في شرح الميزان، للشيخ فضل إمام الخيرآبادي المتوفى في1827م.
53. تلخيص الشفاء، للشيخ فضل إمام الخيرآبادي المتوفى في1827م.
54. الرسالة في اعتبار الماهية، للشيخ الشاه رفيع الدين المتوفى في1833م.
55. التصريح في المنطق، للشيخ القاضي محمد إرتضى المتوفى في1825م.
56. الهدية السعيدية، للشيخ فضل حق الخيرآبادي المتوفى في1861م.

57. الرسالة في الرد على القائلين بحركة الأرض، للشيخ فضل حق الخيرآبادي المتوفى في1861م.[67]

(٥)الرياضيات والطب:

1. الرسالة في المخروطات، للشيخ تفضل حسين المتوفى في1800م.
2. شرح خلاصة الحساب، للشيخ عبد الباسط المتوفى في1808م.
3. الرسالة في الجبر والمقابلة، للشيخ روشن علي المتوفى في1810م.
4. شرح المجسطي، للشيخ عبد العلي بحر العوم المتوفى في1819م.
5. العجاب في الحساب، لمنشي منون لال الهندوسي.
6. القسطاس، لمنشي كندن لال المتوفى في1822م.
7. غاية الفهوم في تدبير المحموم، للشيخ محمد اسحاق خان المتوفى في1768م.
8. موارد الحكم في علاج الأمراض من الرأس والقدم، للشيخ محمد اسحاق خان المتوفى في1768م.
9. كشف الإشكالات حاشية على شرح الأسباب، للشيخ محمد هاشم المتوفى في1770م.
10. تحقيق النبض، للشيخ حكيم أحمدالله المتوفى في1790م.
11. تنقيح الأسباب والعلامات، للشيخ حكيم محمد حسين خان.
12. شرح كليات القانون، للشيخ حكيم شفائي خان.
13. الفوائد الشفائية، للشيخ حكيم شفائي خان.
14. كتاب الحميات، للشيخ حكيم شفائي خان.
15. أسرار العلاج، للشيخ حكيم علي شريف.[68]

(و)علوم التأريخ والتراجم والجغرافيا:

1. سبحة المرجان في آثار هندوستان، للشيخ غلام علي آزاد المتوفى في 1785م.
2. الأحزان على القتيل العطشان، للشيخ سيد دلدار علي المتوفى في 1819م.
3. سر الشهادتين، للشيخ الشاه عبد العزيز المتوفى في 1823م.
4. السيرة المحمدية، للشيخ محمد كرامت علي المتوفى في1832م.
5. ذيل السيرة، للشيخ محمد كرامت علي المتوفى في1832م.
6. الأغصان الأربعة، للشيخ ولي الله اللكهنوي المتوفى في1853م.
7. الرسالة في تأريخ الغدر، للشيخ فضل حق الخير آبادي المتوفى في1861م.[69]

(ز)علوم اللغة والأدب:

1.حاشية على شرح الجامي، للشيخ نور محمد المتوفى في1780م.
2. حاشية على المطول، للشيخ نور محمد المتوفى في1780م.
3. تاج العروس شرح القاموس، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في1791م.
4. القول المبتوت في تحقيق لفظ التابوت، للشيخ محمد مرتضى الزبيدي المتوفى في1791م.
5. شرح الشافية، للشيخ عبد الباسط المتوفى في1808م.
6. عين الهدى شرح قطر الندى، للشيخ عليم الدين.
7. تعليقات على شرح قطر الندى، للشيخ محمد غوث المتوفى في1822م.
8. كافي مختصر الكافية، للشيخ محمد غوث المتوفى في1822م.
9. شافي شرح الكافي في النحو، للشيخ محمد غوث المتوفى في1822م.

10. حواشي على قاموس الفيروزآبادي، للشيخ محمد غوث المتوفى في1822م.
11. إعجاز البلاغة، للشيخ الشاه عبد العزيز المتوفى في1823م.
12. الرسالة في النحو، للشيخ فضل إمام الخيرآبادي المتوفى في1827م.
13. النفائس الارتضائية في شرح الرسالة العزيزية، للشيخ محمد إرتضى علي خان المتوفى في1835م.
14. خطبة الجمعة، للشيخ الشاه ولي الله المتوفى في 1762م.
15. شفاء العليل في إصلاح كلام المتنبي، للشيخ غلام علي آزاد المتوفى في 1786م.
16. كشكول، للشيخ غلام علي آزاد المتوفى في 1786م.
17. شرح قصدة بانت سعاد، للشيخ محمد غوث المتوفى في1822م.
18. المكاتيب، للشيخ الشاه عبد العزيز المتوفى في1823م.
19. شرح أرجوزة الأصمعي، للشيخ الشاه عبد العزيز المتوفى في1823م.
20. مراسلات، للشيخ سيد أحمد الشهيد المتوفى في1830م.
21. مجموعة الخطب، للشيخ الشاه محمد إسماعيل المتوفى في1830م.
22. رقعات، للشيخ الشاه رفيع الدين المتوفى في1833م.
23. المكاتيب، للشيخ رشيد الدين خان المتوفى في1833م.
24. نفحة اليمن فيما يزول بذكره الشجن، للشيخ أحمد بن محمد اليمني المتوفى في1840م.
25. العجاب بما يفيد الكتاب، للشيخ أحمد بن محمد اليمني المتوفى في1840م.
26. المناقب الحيدرية، للشيخ أحمد بن محمد اليمني المتوفى في1840م.
27. الجوهر الوقاد في شرح قصيدة بانت سعاد، للشيخ أحمد بن محمد اليمني المتوفى في1840م.
28. رياض الفردوس، للشيخ محمد حسين خان المتوفى في1859م.
29. أطيب النغم في مدح سيد العرب والعجم، للشيخ الشاه ولي الله المتوفى في1762م.
30. ديوان الشاه ولي الله المتوفى في 1762م.
31. ديوان آزاد، للشيخ غلام علي آزاد المتوفى في1786م.

32. مختارات ديوان آزاد، للشيخ غلام علي آزاد المتوفى في1786م.
33. مرآة الجمال، للشيخ غلام علي آزاد المتوفى في1786م.
34. مظهر البركات، للشيخ غلام علي آزاد المتوفى في1786م.
35. تسلية الفؤاد، للشيخ غلام علي آزاد المتوفى في1786م.
36. أرجوزة في ألقاب حضرة علي، للشيخ محمد غوث المتوفى في1822م
37. التضمين على قصيدة أو قطعة أبيه، للشيخ الشاه عبد العزيز المتوفى في1823م.
38. التضمين على قصيدة جده على النفس، للشيخ الشاه رفيع الدين المتوفى في1833م.
39. مجموعة القصائد، للشيخ فضل حق الخيرآبادي المتوفى في1861م.
40. القصيدة المدحية، للشيخ الحافظ غلام حسين.[70]

فمن الشعراء الذين برزوا في هذه الفترة، نخص بالذكر منهم نموذجا:

1. الشيخ غلام علي آزاد البلكرامي:

هو العلامة غلام علي بن نوح الحسيني الواسطي البلكرامي. ولد في سنة 1704م، وتوفي في سنة 1200هـ (1784م). وكان شاعرا مجيدا ويسمى " حسان الهند " لقصائده الرائعة في مدح النبي صلى الله عليه وسلم. كانت له دواوين شعر عديدة في اللغة العربية، وجمع سبعة منها في مجموعة سماها " السبعة السيارة ".[71]

2. الشيخ ذوالفقارعلي الديوبندي:

ولد ونشأ بديوبند. وكان شاعرا عظيما ماهرا بالفنون الأدبية. توفي في سنة 1322 الهجرية.[72]

ومن العلماء والأدباء والمحققين يشتهر منهم على سبيل المثال:

1. العلامة نواب صديق حسن خان:

هو السيد صديق حسن خان بن أولاد حسن بن أولاد علي الحسيني البخاري القنوجي. ولد في سنة 1832م، وتوفي في سنة 1889م.كان يمثل "مدرسة الحديث" في الهند، وله مؤلفات عربية كثيرة في التفسير، والتراجم، واللغة، والأدب، أشهرها "أبجد العلوم". [73]

2. العلامة عبد الحئ اللكهنوي:

هو الشيخ أبو الحسنات عبد الحي بن عبد الحليم اللكهنوي. ولد في سنة 1847م، وتوفي في سنة 1885م. وكان نادرة الزمان في الاطلاع الواسع في مختلف العلوم. وله أكثر من ثمانين مؤلفا في العلوم العقلية والنقلية.[74]

3. مولانا أشرف علي التهانوي:

ولد الشيخ أشرف علي التهانوي بـــ "تهانه" في سنة 1280 الهجرية. وله مصنفات كثيرة ما بين صغير وكبير يبلغ عددها إلى نحو 800. إثنا عشر كتابا منها بالعربية أهمها أنوار الوجود في أطوار الشهود، والتجلي العظيم في أحسن تقويم، وسبق الغايات في نسق الآيات. توفي في سنة 1362 الهجرية.[75]

4. السيد سليمان الندوي:

هو الشيخ السيد سليمان بن أبي الحسن الحسيني. ولد في بهار(الهند) في سنة 1302 الهجرية، وكان مؤلفا كبيرا. توفي في سنة 1953 الميلادية.[76]

5. الشيخ عبدالعزيز بن أحمد الملتاني:

ولد هذا العالم النحرير في حدود سنة 1794 الميلادية، وتوفي في شبابه. كان واسع المعرفة، وكثير التأليف. ومن مؤلفاته في العربية:

(1) الإكسير (في ثلاث مجلدات)

(2) اليواقيت في علم المواقيت

(3) العنبر الأسهب (في الطب)

(4) الحاشية العزيزية على إيساغوجى

(5) نعم الوجيز في البيان والبديع

(6) النبراس في شرح العقائد[77]

6. الشيخ عبدالرشيد الكشميري:

لانعرف عن نشأته إلا أنه درس على علماء كشمير ولاهور وكان له عناية باللغة والأدب والحديث، وله مؤلفات في هذه العلوم. ومن مؤلفاته:

"القطر الطيب في مدح الإمام أبي الطيب" (المتنبي)[78]

7. الشيخ فيض الحسن السهارنبوري:

كان أستاذاً بالكلية الشرقية بجامعة بنجاب ورئيس التحرير للمجلة العربية "شفاء الصدور" التي أصدرها هذه الكلية. ولد في سهارنفور بالهند سنة 1816 الميلادية، وتوفي في لاهور سنة 1887 الميلادية. ومن مؤلفاته اللغوية والأدبية في اللغة العربية:

(1) رياض الفيض شرح المعلقات السبع

(2) الفيضي شرح ديوان الحماسة

(3) فيض القاموس شرح خطبة القاموس

(4) ديوان الفيض[79]

8. الشيخ القاضي طلاء محمد البشاوري:

كان من أحد أدباء القرن التاسع عشر. توفي في سنة 1892م. وكان له ديوان صغير اسمه "نشأة الطرب في أشواق العرب"[80]

9. المفتي محمد عبدالله التونكي:

كان عالمانحريراً، ودرّس اللغة العربية في الكلية الشرقية بجامعة بنجاب لمدة 34 سنة توفي في سنة 1920 الميلادية ومن مؤلفاته:

(1) عجالة الراكب

(2)[81] التعليقات على شرح سلم العلوم

(3) الأنوار الزاهية في ديوان أبي العتاهية[82]

10. مولانا شبير أحمد العثماني:

كان من مشاهير علماء ديوبند، وقد شارك بحماس في حركة إنشاء باكستان، وصار عضو المجلس الدستوري لها بعد إنشاء ها. توفي في سنة 1949الميلادية وله "فتح الملهم شرح مسلم" في اللغة العربية وقد ذاعت صيته [83]

11. مولانا أصغر علي روحي:

كان أستاذ اللغة العربية في الكلية الإسلامية بلاهور. توفي في سنة 1954 الميلادية. ومن مؤلفاته:

(1) العروض والقوافي

(2) ما في الإسلام المرجع نفسه ج 2ص411.

12. الدكتور المولوي محمد شفيع:

ولد هذا العالم النحرير الباكستاني في سنة 1883 الميلادية في بلدة قصور. وبعد الحصول علي شهادة الماجستير، عين أستاذاً في جامعة بنجاب. صار عميد الكلية الشرقية من سنة 1936 الميلادية إلى سنة 1942 الميلادية, كما كان رئيس ''موسوعة الأردية للمعارف الإسلامية'' توفي في سنة 1963 والميلادية.وبجانب مئات من المقالات ، له مؤلفات عديدة بارزة مثل:

(1) فهارس العقد الفريد لابن عبدربه

(2) تتمة صوان الحكمة لعلي بن زيد البيهقي

(3) درة الأخبار [84]

13. مولانا عبدالعزيز ميمن:

ولد هذا العالم والمحقق والأديب الكبير حوالى سنة 1889 الميلادية. وبعد التخرج بجامعة بنجاب، جعل يدرس في جامعات كثيرة مثل جامعة عليكره، وجامعة كراتشي، وجامعة بنجاب، كما أنه خدم اللغة العربية كثيراً كرئيس القسم العربي بجامعة بنجاب ورئيس مجمع البحوث الإسلامية بكراتشي. قد ألف الشيخ الميمني كتابا طبع من القاهرة وكان اسمه ''أبوالعلاء وما إليه'' كما أنه حقق كتبا عديدة مثل:

(1) ماتفق لفظه واختلف معناه من القرآن للمبرد

(2) الفاضل للمبرد

(3) نسب عدنان وقحطان للمبرد

(4) الوحشيات لأبي تمام

(5) ديوان حميد بن ثور الهلالي

(6) ديوان شحيم العبد

(7) كتاب التنبيهات لابن حمزة .[85]

إصدارالمجلات والصحف العربية:

قد أصدرت خلال الفترة الإنجليزية مجلات وصحف عربية تدل على عناية المسلمين شبه القاريين بنشر وحفاظ اللغة العربية. ومن المجلات العربية:

(1) مجلة البيان، هي مجلة شهرية كانت تصدر من لكهنو، وكان الشيخ عبد الله عمادي والشيخ عبد الرزاق المليح آبادي الندوي في مجلس تحريرها.

(2) مجلة "الضياء"، هي أيضا مجلة شهرية تصدر من ندوة العلماء بلكهنو. أنشأها الأستاذ مسعود عالم الندوي، وجذبت أنظار العلماء في البلدان العربية.

(3) مجلة "البعث الإسلامي"، هي أيضا مجلة شهرية تصدر من ندوة العلماء لنشر الدعوة والأفكار الإسلامية.[86]

أما الجرائد والصحف العربية،فيجدر بالذكر هنا:

(1) جريدة "الجامعة"، هي جريدة أسبوعية تصدر من كلكتا تحت إشراف العالم الجليل مولانا أبو الكلام آزاد.

(2) صحيفة " الرائد"، هي أيضا جريدة ندوية أسبوعية تنشرها طلبة دار العلوم.

(3) جريدة " الكفاح"، كانت تصدرها جمعية علماء الهند من دهلي.

(4) جريدة " الدعوة"، كانت تصدرها الجماعة الإسلامية.

(5) جريدة " صوت الجامعة"، كانت تصدرها الجامعة السلفية ببنارس في الهند.

(6) جريدة " دعوة الحق"، كانت تصدر من دار العلوم بديوبند،وظهرت مكانها الآن " الداعي".[87]

الهوامش

[1] . للتفصيل راجع: بريلوي ، سيد مصطفى علي ، انگريزون كي لساني پاليسي، اكيدمي آف ايجوكيشنل ريسرچ، كراچي،1970م. ص ص 17-40

[2] Reginald Massey,Macaulay's Legacy, Daily Dawn Books & Authors, March 28, 2010.

[3] الساداتي، أحمد محمود ، تأريخ المسلمين في شبه القارة الهندية وحضارتهم، مكتبة الآداب، القاهرة، 1957م. ج 1 ص ص 223- 238.

[4] Seyed Nurullah & J.P. Naik, A History of Education in India, Macmillan & Co. Bombay,1951. p.3

[5] المرجع نفسه ص 30

[6] المرجع نفسه ص 15

[7] انظر للتفصيل: الندوي، رضوان الدكتور ، اللغة العربية وآدابها في شبه القارة الهندية الباكستانية، جامعة كراتشي، 1994م، ص 270 و ص 353

[8] I. H. Qureshi, A Short History of Pakistan, University of Karachi, 1992. pp. 717-727

[9] Seyed Nurullah & J.P. Naik p 57

[10] Zubaid Ahmad,The Contribution of Indo-Pakistan to Arabic Literature, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1968. p. LIII

[11] Seyed Nurullah & J.P. Naik p. 59

[12]. المرجع نفسه ص 82

[13] المرجع نفسه ص ص 85 – 86

[14] المرجع نفسه ص 91

[15] المرجع نفسه ص92

[16] المرجع نفسه ص94

[17] المرجع نفسه ص132

[18] المرجع نفسه ص133

[19] المرجع نفسه ص133-134

[20] M.S.Thirumalai, "Lord Macaulay, The man who started it all, and his minute", p13. This article was published in the journal "Language in India" vol.3, April,2003. The access to the article is through: http://www.languagiinindia.com/april2003/macaulay.html#minute

[21] المرجع نفسه ص 17

[22] المرجع نفسه ص 18

[23] . Seyed Nurullah & J.P. Naik, pp 142-44

[24] المرجع نفسه ص 311

[25] المرجع نفسه ص 316

[26] المرجع نفسه ص272

[27] المرجع نفسه ص277

[28] المرجع نفسه ص 281

[29] المرجع نفسه ص 282 – و غلام حسين ذوالفقار، صد ساله تاريخ جامعه بنجاب ، جامعه بنجاب، لاهور. 1982م. ص ص 36-52

[30] Seyed Nurullah & J.P. Naik, p 405

[31] المرجع نفسه ص407

[32] I. H. Qureshi, pp. 830-36

[33] Seyed Nurullah & J.P. Naik, p. 580

[34] المرجع نفسه ص ص 4-583

[35] . المرجع نفسه ص ص7- 505

[36] I. H. Qureshi, pp. 848-54

[37] Seyed Nurullah & J.P. Naik, pp. 627-28

[38] المرجع نفسه ص629

[39] المرجع نفسه ص632

[40] المرجع نفسه ص650

[41] المرجع نفسه ص718

[42] المرجع نفسه ص720

[43] المرجع نفسه ص ص 760- 763

[44] المرجع نفسه ص 800

[45] خالد اختر، عربي لغت مين انكريزون كي خدمات(رسالة جامعية أردية) ، جامعة بنجاب، لاهور، 1978م. ص 67

[46] عبيدة بيكم، فورت وليم كالج كي ادبي خدمات، سيتي بك بوائنت، كراتشي، 2004م، ص ص 44- 56.

[47] المرجع نفسه ص 397.

[48] المرجع نفسه ص 34

[49] غلام حسين، تاريخ يونيورستي أورينتل كالج، بنجاب يونيورستي، لاهور، 1962م، ص ص 121- 127

[50] .لائتنر، جي. دبليو. ، مقدمة النحو العربي الفلسفي بتحقيق الدكتور ظهور أحمد أظهر، دار الطباعة الحديثة، بشاور، باكستان، 1991م، ص ص 17- 19.

[51] المرجع نفسه

[52] غلام حسين، ص ص 144-46.

[53]http:// www. Burtoniana.org /biography/1906 & http:// www. Kittybrewster.com/members/k_1.html

[54] http://www.burtoniana.org.
www.bookrags.com/biography/richard_francis_burton_sir.

[55]
http://www.encyclopedia.jrank.org/GUI_HAN/HALHED_NANTHIAL_BRASSEY_1751_1.html & http://www.absoluteastronomy.com/topics/Nanthian_Brassey_Halhed

[56]http://www.encyclopedia.jrank.org/WAT_WIL/WILLIAM_GIFFORD_PALGRAVE_182618.html

[57] أبو الحسن الندوي،المسلمون في الهند، الصدف ببلشرز، كراتشي، 1987م، ص ص 17-116

[58] عبد الغفور مدني، تدريس اللغة العربية بالمدارس الدينية في باكستان دراسة وتحليل(1947م- 2007م)، جامعة بنجاب(رسالة جامعية)، 2009م، ص ص38-40

[59] المرجع نفسه ص 44

[60] أبو الحسن الندوي، ص 116، و شيخ محمد اكرام، موج كوثر، اداره ثقافت اسلاميه، لاهور،2003م. ص ص206-11

[61] عبد الغفور المدني، ص 48

[62] المرجع نفسه ص ص49-50

[63] ابو الحسن الندوي، ص ص 116-20

[64] Zubaid Ahmad, pp 285-90

[65] المرجع نفسه، ص ص 302-309

[66] المرجع نفسه، ص ص 323-341

[67] المرجع نفسه ص ص 363-429

[68] المرجع نفسه ص ص 430-442

[69] المرجع نفسه ص ص444-451

[70] المرجع نفسه ص ص 465-484

[71] الندوي، رضوان الدكتور، ص ص 301-8

[72] نزهة الخواطر، ج 8 ص ص 140-144)

[73] المرجع نفسه ص ص 420-29

[74] المرجع نفسه، ص ص413-16

[75] نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، العلامة عبد الحي الحسني، دائرة المعارف العثمانية، حيدرآباد، الهند، 1947م. ج 8 ص ص 56-59

[76] نزهة الخوطر، ج 8 ص ص 163-69

[77] اللغة العربية وآدابها في شبه القارة الهندية الباكستانية ص 341

[78] المرجع نفسه ص 403

[79] اللغة العربية وآدابها في شبه القارة ص ص 410ــ 144 وتاريخ أدبيات ج 4ص ص402ــ 403 وشروح ديوان الحماسة وتراجمه في شبه القارة(رسالة ماجستير)، حافظ مقيت جاويد ، جامعة بنجاب 1993م. ص ص 39ــ 77.

[80] اللغة العربية وآدابها في شبه القارة ص ص 430- 431.

[81] .

[82] تاريخ أدبيات ج 2ص407.

[83] المرجع نفسه ج 2ص410.

[84] المرجع نفسه ج 2ص412.

[85] المرجع نفسه ج 2ص ص 414 ــ 415.

[86] . الندوي أبوالحسن، ص ص 46-47

[87] . المرجع نفسه ص ص47-48

المصادر والمراجع

* بريلوي ، سيد مصطفى علي ، انگريزون كي لساني پاليسي، اكيدمي آف ايجوكيشنل ريسرچ، كراچي،1970م.

* الساداتي، أحمد محمود ، تأريخ المسلمين في شبه القارة الهندية وحضارتهم، مكتبة الآداب، القاهرة، 1957م

* الندوي، رضوان الدكتور ، اللغة العربية وآدابها في شبه القارة الهندية الباكستانية، جامعة كراتشي، 1994م

* غلام حسين ذوالفقار، صد ساله تاريخ جامعه بنجاب ، جامعه بنجاب، لاهور. 1982م.
* غلام حسين، تاريخ يونيورسيتي أورينتل كالج، بنجاب يونيورسيتي، لاهور، 1962م
* خالد اختر، عربي لغت مين انكريزون كي خدمات(رسالة جامعية أردية) ، جامعة بنجاب، لاهور، 1978م.
* عبيدة بيكم، فورت وليم كالج كي ادبي خدمات، سيتي بك بوائنت، كراتشي، 2004م
* لائتنر، جي. دبليو. ، مقدمة النحو العربي الفلسفي بتحقيق الدكتور ظهور أحمد أظهر، دار الطباعة الحديثة، بشاور، باكستان، 1991م
* أبو الحسن الندوي،المسلمون في الهند، الصدف ببلشرز، كراتشي، 1987م
* عبد الغفور مدني، تدريس اللغة العربية بالمدارس الدينية في باكستان دراسة وتحليل(1947م- 2007م)، جامعة بنجاب(رسالة جامعية)، 2009م
* شيخ محمد اكرام، موج كوثر، اداره ثقافت اسلاميه، لاهور،2003م

*Reginald Massey,Macaulay's Legacy, Daily Dawn Books & Authors, March 28, 2010

* Seyed Nurullah & J.P. Naik, A History of Education in India, Macmillan & Co. Bombay,1951

* I. H. Qureshi, A Short History of Pakistan, University of Karachi, 1992

* Zubaid Ahmad,The Contribution of Indo-Pakistan to Arabic Literature, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1968. p. LIII

المصادر الشبكية

http://www.languagiinindia.com/april2003
http:// www. Burtoniana.org
http:// www. Kittybrewster.com
http:// www.bookrags.com
http:// www.encyclopedia.jrank.org
http://www.absoluteastronomy.com

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 31, Sr.No.79, 2010, pp 129 - 136

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۱، اپریل۔جون ۲۰۱۰ء، شمارہ ۷۹

خصائص الإمام أبي جعفر محمد الباقر (رضی اللہ عنہ) في ضوء "كشف المحجوب"

مفتي محمد رمضان سيالوي☆

Abstract:

Kashf-ul-Mahjoob is a matchless composition written on the mysticism of Imam ul Aulia ALI BIN USMAN AL HAJVERY commonly known as Hazrat DATA GANJ BUKSH rematullah alleyhe.The biography of the Great personalities of Islam have been precisely narrated in this composition along with the multiple articles. Among them Fellows of The Prophet (pbuh), Family of The Prophet (pbuh), followers of the fellows of The Prophet (pbuh) and the followers of the followers of the fellows of The Prophet (pbuh) are specifically mentionable.The one of them is Hazrat Imam Baqir(may GOD be pleased with him)..Some demographics of Hazrat Imam Baqir(may GOD be pleased with him)are briefly described in Kashf-ul-Mahjoob…which is a landmark of Hazrat Imam Baqir,s Persona..The under view article is the short reflection of Hazrat Imam Baqir,s persona in the light of these demographics.Which has been compiled with the refrences of various authentic books along with the Kashf-ul-Mahjoob...

يعتبر كتاب "كشف المحجوب" علىٰ قمة أُمهات الكتب التِى كُتبتْ في علم التصوّف وهٰذهٖ مِنَّةٌ محضةٌ من فضل الله سبحانهٗ وتَعالىٰ ولاتأتي هٰذهٖ المَزْيَةُ إِلَّا بالعناية الإلهيّةِ الخالصةِ لذلک يحمل هٰذا الكتاب القيّمُ الرائع النفيسُ شرفًا أساسيًّا إنفعاليًّا حول التصوّف في اللغة الفارسيةِ [1]، ومن جهةٍ يحتوي علىٰ مصطلحاتِ التصوّفِ

☆ خطيب بجامع غنج بخش علي الهجويرى بلاهور

احتواءً كاملًا وشروحاً رائعًا فريدا ومن جهة اخرىٰ كتاب "كشف المحجوب" هو مجموعةٌ تربويّةٌ شاملةٌ علىٰ تراجم خلفاء الراشدين وآئمة أهل البيت وأصحاب الصُفّةِ وآئمةِ التابعينَ وتابع التابعين وغيرهم من أئمة التصوف(رضوان اللّٰه تعالىٰ عليهم اجمعين).

و شيخنا علي الهجويري (حمه الله) ذكر مَزَايا خاصّةً لهؤلاء الرجالِ الأتقياءِ موجزاً بأقوالهم وأفعالهم بصِبُغَةِ الله تعالىٰ وأقام الشيخُ علي بن عثمانِ الهجويرى بابًا خاصًّا باسُمِ "تذكرةِ آئمةِ أهلِ البيت"و سَطرَ فيه مقالةً طَيّبَةً حول شخصيَّةِ "إمام الباقر"–رضی اللہ عنہ– كما كتب الشيخ في نفسِ الباب مقالاتٍ حول شخصيَّةِ إمام حسن وحسين وزين العابدين وجعفر الصادق–رضى الله تعالى عنهم–

و ذكر الشيخ الهجويرى–رحمة الله تعالىٰ– خصائصَ تلك الأئمة فى "كشف المحجوب" منفصلاً وكتَبَ في بابِ "تذكرةِ آئمةِ أهل البيتِ" كتابًا حول أكابر أهل البيتِ النبويّ ببيانِ المحبّةِ والوجدانِ. وعندما نطالعُ ما كتب الشيخ نستنتجُ مِن هذا ... كم كان يحبّ الشيخ علي الهجويري أكابر أهل البيتِ؟ وماذا كان عقيدتُهُ تلك الأرواح الطاهرة الكريمة؟

وما هي المزايا لهؤلاء الأئمّة الذين تَجَرَّدُوْا عَنِ الدنيا فَدانَتْ لَهمُ فاسْتَذَلّوها وسخروها لخدمةِ مولاهمُ وعكَفُوْا بالذُلِّ علىٰ بابِ الله تعالىٰ، فأوْرَثَهُمْ بالعِزِّ وَالشَّرَفِ والكرامةِ.

كما قال الشيخ الهجويرى في "كشفِ المحجوب".

آناں كه بطهارت ... خاص وعام ايشاں (۳)

معناه: أهل بيت النبوّةِ اخْتَصَّهُم اللهُ تعالىٰ وطهَّرهُمْ تَطْهِيراً، وعُيّنَ كلُّ فَرْد مِنْ أفرادهم علىٰ مراتب عليا مِنَ الطهارةِ، وتلك النفوس القدسيّة تكون كاملاً في طرقِ التصّوفِ إمَاماً وهادياً إلىٰ الرشدِ بواسطةِ سلاسلِ التصّوفِ المختلفةِ.

ويُقَدِّمُ الشيخ–رحمه الله– كلامَ الشوقِ والمحبّةِ حول شخصِّيةِ إمام الباقر–رضی اللہ عنہ– قائلًا:

ومنهم نيز حجت ... أبي طالب الباقر (۴)

فمعناه: ومِنْ آئمةِ هؤلاء، الإمام أبو جعفر محمد بن علي بن حسين بن علي بن أبى طالب الباقر، الذي كان حُجّةً منيراً لأهلِ المعاملةِ، وبُرْهاناً لأهل المشاهدةِ كما هو إمامٌ مِنَ الآئمةِ مِنْ

أولاد النبيّ الكريم –a– ومعزّزٌ من سلالة سيّدنا علي بن أبي طالب– كرّم الله وجههُ–.

أما أحوالُ الإمام الباقرِ فَتُورد في كشف المحجوب مختصراً حسب الآئمة المذكورةِ بذكْرِ بعضِ معلوماتٍ مفصّلةٍ، ولا ريب في أنّ الإمامَ الباقرَ–رضي الله عنه– يكون صاحبَ الأوصافِ الحميدةِ والفضائلَ النبيلةِ كما ذكر الشيخ الهجويري فضيلتين من فضائلهِ الباهرةِ.

إسمُهُ "محمد" وكنيتُهُ "أبو جعفر" و"أبو عبد الله" وكان لقبُهُ باقراً وهو ولد في المدينة المنوّرةِ ٣ من شهر الصفر ٥٧هـ في يوم الجمعة المباركة.(٥)

وكان الإمام الباقر مِنْ أولاد إمام علي زين العابدين وحفيد إمام الحسين–رضي الله عنه– وكما كان حفيد الحفيد لسيّدنا علي بن أبي طالب–كرم الله وجههُ– وكان اسم والدتهِ الكريمة التقيّة "فاطمة بنت حسين بن علي" وهٰكذا كان الإمام الباقر"نجيب الطرفين هاشميًّا مِنْ أبوَيْنِ الكريمين"، والإمام الباقر توفي ١١٤هـ في مدينة الرسول ﷺ وكان عمرهُ ٥٧ عاماً، وتشيّع جثمانه الطاهر في البقيع بجوار والدهِ المرحوم.

والجدير بالذكر هو أنّ النبيّ الكريمﷺ أخْبَرَ بولادتهِ بإسمهِ، وأرسَلَ سلامَهُ عليه بجابر بن عبد الله–رضي الله عنه– كما روىٰ الإمام الباقر قائلاً:

جئتُ إلىٰ جابر بن عبد الله –رضي الله عنه– وبصارتُهُ فَقَدَتْ، سَلَّمتُ عليه وأجابني وَسَألَ: مَنْ أنتَ؟ فقلتُ: أنا محمد بن علي بن حسين –رضي الله عنه– فقال لي جابر: يا بُنَيَّ! اقترب إليَّ فاقْتَرَبْتُ إليه، فضمَّنِيْ بصدرهِ وقَبَّلَ جابر أيدي باكيًا ثُمَّ قَالَ: "رسولُ الله ﷺ سَلَّمَ عليكَ" فسئلتُ: وكيف هٰذا؟ فقال لي جابر: مرةً كنتُ عند رسول اللهﷺ وهو نظر إلى الحسين –رضي الله عنه– فقال: هٰذا ابني ويُولد عندهُ وَلَدٌ يكونُ اسمهُ "على بن حسين" وهو يكون سيد العابدين.

وقال رسول الله ﷺ أيضًا:

يُوْلَدُ لِعَلِيّ بن الحسينِ ابنٌ يقال لهُ: مُحَمَّدٌ؛ إذا رأيتَهُ يا جَابِرُ فاقْرِئْهُ مِنّيْ السَّلامَ.(٧) وفي روايةٍ: يؤتىٰ بالحكمةِ والأنوارِ(٨) وعنه صدر كرامات كثيرة(٩) وله كرامة معروفة وذكرها سيّد علي الهجويري في كشف المحجوب وهي:

مَرّةً مَلِكٌ من الملوكِ طَلَبَهُ إلىٰ قصرهِ بإرادةِ القتلِ (١١) وَعندما حَضَرَ عندهُ هو أكرمَهُ إكرامًا بليغًا ثُمَّ أعطاه الهدايا الغالية عند عودتهِ، فتَحَيَّرَ الحاضرون المشاهدون بمعاملةِ

الملک تحيُّرًا عجيبًا فسئلوا الملکَ أسبابَ إكرامِهِ والهدايا، فأجابهم الملکُ: واللهِ! أسديْنِ قائمينِ يمينَهُ وشمالَهُ فقالا: لو أردتَ قَتْلَهُ فنُهْلِكُکَ فَورًا. (۱۲)

وَذكر سيّد علي الهجويري –رحمه الله– خصوصيةً من خصائصه الباهرةِ وهي: تَبَحُّرُ علمِهِ كانت تفسيراً منيراً. كما أشار صاحب كشف المحجوب باللغة الفارسيةِ أيضًا:

مخصوص بود بدقائق علوم ... كتاب خداى عزّوجلّ. (۱۳)

و معناه: اشتهر الإمام الباقر بعلومٍ دقيقةٍ واستدلالاتٍ لطيفةٍ من كتاب الله عزّوجلّ.

و اشتهر الإمام بلقبهِ "الباقر" لأجل مكانتهِ العلميّةِ، ونرىٰ في المعاجم العربيّةِ: بَقَرَ يَبْقَرُ أي: فَتْحًا وفَجْرًا ووُسْعًا. (۱۴)

والزبيدي، صاحب تاج العروس، ذكرفى ترجمتهِ البسيطة يقول: وإنّما لُقّبَ بهِ لِتَبَحُّرِهِ في العِلْمِ وَتَوَسُّعِهِ (۱۵) وَصَرَّحَ ابن خلكان بقولهِ:

أنَّ الإمام الباقر –رحمة الله– هو صاحب النظر الواسعِ فى علومٍ مختلفةٍ لأنّهُ يشرح شتّى العلومِ شرحاً كاملاً بكل تصريحٍ وتوضيحٍ (۱۷)

والإمام قرظى قال بشؤونهِ العلميّةِ مُنْشِدًا:(۱۸)

يا باقِرَ العِلْمِ لأهْلِ التُّقىٰ وَخَيْرَ مَنْ لَبّٰى عَلٰى الأجْبُلِ

و عبد الله بن عطاء يذكر منظر حلقة علمهِ:

مَا رَأَيْتُ العلماءَ عند أحَدٍ، أصْغَرَ عِلْمًا مّنْهُمْ عنْدَ أَبِيْ جَعْفَرَ، لَقَدْ رَأيتُ الحَكَم عِنْدَهُ كَأنَّهُ مُتَعَلِّمٌ. (۱۹)

والإمام الباقر –رضی اللہ عنہ– له أقوال ذهبيّةٌ لا يُبالغ إذا تكتبُ بماءِ الذهبِ ومنها:

"وفات عالمٍ عند إبليس خيرٌ مِنْ ألفِ عابدٍ"

و وجد الإمام هذه القدرة بسبب إستدلال لطيف ودراسةٍ منهجية لكتاب الله سبحانه وتعالى.

وأذكر على هٰذا نموذجًا وفق ما كتب سيد علي الهجويري فى "كشف المحجوب" تحت قوله تعالىٰ:

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيؤْمِنْ بِاللهِ. (۲۱)

قال الإمام الباقر –رضی اللہ عنہ– في تفسير هذهِ الآية المباركة قولاً ذَهَبِيًّا ألا وهي:

"كُلُّ مَنْ شَغَلَکَ عَنْ مُطَالَعَةِ الْحَقِّ فَهُوَ طَاغُوْتُکَ" (٢٢)

وَمَالِک بن أعْيُن الجهني كَتَبَ قصيدةً في مدح الإمام وَيبدو منها كثرةُ تَطَلّعِهٖ فِي علومِ القرآن الكريمِ بنظرٍ ثاقبٍ حيث أنْشَدَ:

- إِذَا طَلَبَ النَّاسُ عِلْمَ القُرْآنِ = كَانَتْ قُرَيْشٌ عَلَيْه غَيَالًا
- وَإِنْ قِيْلَ: إِنّي ابْنُ بِنْتِ الرَّسُوْلِ = نِلْتُ بِذَلکَ فَرْعًا طَوِيْلًا
- نجومٌ تُهَلِّلُ للمُدْلجِيْنَ = جبالٌ تُوَرِّثُ عِلْمًا جبالًا.

ولهٗ استدلالٌ لطيفٌ رائعٌ علٰى ستةِ آياتٍ من القرآنِ الكريمِ وكلّ لفظٍ من ألفاظهٖ يحتوى على الكثير من المعلوماتِ ذات ألوانٍ علميّةٍ ونكاتٍ لطيفةٍ. (٢٣)

وَيُلاحَظُ تاريخ دمشق لابن عساكر لإسناد الإمام الباقرِ ومنهجهٖ العلمي.

أمّا تضرّعُهٗ وورعُهٗ فنجد أيْضًا في كشفِ المحجوب، بأنَّهٗ يعبد اللهَ تعالٰى كثيراً ويخشاه ويُعَطِّرُ ليلهٗ بمناجاتٍ إلٰهِيَّةٍ وبقيام اللّيلِ وهٰذا مذكورٌ فى "كشفِ المحجوب" بقدرٍ من التفصيلِ.

ومن معمولات الإمام الباقر –رضي الله عنه– هى بأنّه يدعو الله تعالٰى بصوتٍ عالٍ بعد قراءةِ الأورادِ المختارةِ ليلاً هٰكذا:

يا إلٰهى! يَغْشٰى اللَّيْلُ بظلمتِهٖ وانتهٰى شغل الملوكِ تلمعُ النجومُ علَى السماء ونامتْ المخلوقُ كأنها لا وجودَ لها وصَمَتَ الناسُ بإصواتهم، نامتِ العيونُ ويَستريحُ بني أُمَيّةَ وعلى أبوابهم حُرّاسُهُمْ وديوانُ بني أُميّةَ مُغْلَقٌ وخدّامُهُمْ يَحْفظونَهُمْ وهُمْ يَسْمَحُوْنَ لمَنْ يشاء ون بأن يَرْتاحَ وَ ينامَ.

يا الٰهى! أنتَ حيٌّ قيومٌ وأنت بصيرٌ عليمٌ، لا تأخذک سنةٌ ولا نومٌ والمحرومُ مَن حُرِمَ مِنْ إنعامک ويَظنُّ أنّکَ تنامُ وتَرْتاحُ!

يَا مَولايَ! لاَ تلُوْمُکَ لَومَةَ لائمٍ وَلا تَقَعُ الخَلَلُ فِي بَقَائِکَ لَيْلًا وَنهارًا وَأبوابُ رحمتِکَ وَغفرانِک مَفْتوحةٌ؛ وَمَنْ يُنَادِيْکَ فَتَغْفِرُهٗ بِكُنُوزِ غُفْرَانِکَ وَمَنْ يَحْمَدُکَ وَيُثْنِيْکَ فَلا تَرُدُّ السَّائِلِيْنَ لأنکَ مَالکُ الملَکِ وَ لا تَرُدُّ إِذَا سَأَلَکَ عَبْدُکَ الْمُؤْمِنُ وَلَوْكَانَ السَائلُ مِنْ أهلِ السمٰوٰتِ وَالأرْضِيْنَ!

يَا الٰهى! حِيْنَ أُخَيِّلُ خِيالَ المَوْتِ وَالقَبْرِ والحسابِ فَأُفَكِّرُ السكينةَ لمَنْ أطلُبُ وَحِيْنَمَا

أُخَيِّلُ عن مَلَکِ المَوْتِ فأخافُ فَأفِکّرُ لِمَ أتعَلَّقُ بالدنيا!

يَا إلٰهي! لا أَسْأَلُ إلَّا مِنکَ لأنّنِيْ أعْرِفُکَ فَأجِدُ راحَةً قلبِيَّةً حِيْنَ أذْکُرُکَ.

يَا الٰهي! أعطِنيْ رَاحَةً عند المَوْتِ وَ أَدْخلني الجنةَ بِغَيْرِ حسابٍ.

وَ هٰکذا يَبِيْتُ الإمامُ الجليلُ لَيَالِيْهِ بالتَّضَرُّعِ والبکاءِ والإلْحَاحِ بالدعاءِ.

وهناک عَبْدٌ يَخْدُمُ الإمامَ الصَالِحَ خِدْمَةً وَکَانَ اسمُهُ "أفْلَح" يروي. مَرَّةً ذهبْتُ إلٰى الحجّ بمرافقةِ هٰذَا الإمام الجليل – ﷺ – فعندما دَخَلَ الإمامُ بيتَ اللهِ العتيق إلتَفَتَ إلٰى الکعبةِ المشَرَّفَةِ إذْ بکٰى بکاءً شديداً، فَغَلَبَتِ الرِقَّةُ عليه، فقلتُ لهُ:

يَا مولايَ! أُناسٌ يَنْظُرُوْنَ إليکَ! فَخَفِّفْ بُکَاءَ کَ لَوْ سَمَحْتَ؟ فَقَالَ الإمامُ الباقرُ: ياأفْلَحُ! أنا أبکِيْ بِصَوْتٍ عَالٍ لکيَ يَنْظُرَ اللهُ تَعَالٰى، إلَيَّ بِالشَّفَقَةِ وَالرَّحْمَةِ وَهُوَ يَغْفِرُ لِي وَ أَنَا أَفْلَحُ فِي يَوْمِ الْقِيَامَةِ، ثُمّ طَافَ الإمامُ وَ صَلّٰى رَکعتَيْنِ عند مقامِ إبْرَاهِيْمَ وَ ارْتَفَعَ الإمامُ رأسَهُ مِنْ مَکانِ السجدةِ وَ بلَّلَتِ الأرضُ بدموعِهِ(۲۵)

الإکثارُ في العبادةِ بلغتْ عندهُ إلٰى درجة اليقينِ عبد الله بن يحيٰى يقول:

"الإمام الباقر – ﷺ – کا ن يُصَلّي خمسين رکعةً من النوافل مع الفرائض. (۲۶)

کان – ﷺ – قدوةً حسنةً في الرشدِ والهداية والخُلُقِ والأعمالِ الصالحةِ دون شکٍ، کما أشار إلٰى هذا الأمر الإمام ابن حجر المکي– رحمة الله– بقوله:

کان – ﷺ – صورةً عمليةً مثل ظبيه الإمام زين العابدين – ﷺ – حصراً فى الزهد والعبادة والعلم. (۲۷)

وکان لهُ الأثُر البالغُ في إنقاذ الخلقِ من ظلماتِ الجهلِ إلى نور العلم، ومن طامّاتِ الضلالِ إلٰى حقائقِ الهداية لأنّهُ کَان صاحبَ الفضائلِ والکمالاتِ الرفيعةِ.

وفي "کشف المحجوب" يذکر شيخنا ووسيدنا علي بن عثمان الهجويري–تغمد اللهُ بغفرانهِ– بعض من فضائلهِ الباهرة وبقدرِ هٰذا يکفى على بيان قدوةِ أعمالهِ إجمالاً وتفصيلاً ، والرجالُ الذين صدقوا مع الله تَعالى. تُعرفُ بالعلمِ النافع والعملِ الصالحِ وسيّد علي الهجويرى کتب بِقَدَرِ مَا اسْتَطَاعَ عَلٰى مراتب عِلْمِهِ وَ زهدهِ وورعهِ کأنهُ يقول:

مَنْ طَابَتْ سَرِيْرَتُهُ حُمِدَتْ سِيْرَتُهُ.

☆☆☆☆

﴿المصادر والمراجع﴾

١. النظامي، خليق أحمد، بروفيسور، تاريخ مشائخ جشت، ص ٩٨.

٢. الهجويري، علي بن عثمان، كشف المحجوب، ص ٩١.٩٤، انتشارات مركز تحقيقات فارسي إيران وباكستان.

٣. نفس المرجع، ص ٩١.

٤. نفس المرجع، ١٠٠.

٥. عبد الرحمن الجامي، شواهد النبوّة،مترجم،ص ٣١٧.

٦. انظر: التاريخ الكبير وحلية الأولياء وطبقات ابن سعد وتهذيب التهذيب ووفيات الأعيان.

٧. مجمع الزوائد، ١٠ / ٢٢، ولسان الميزان، ٥/ ١٩٠.

٨. عبد الرحمن الجامي،شواهد النبوّة،مترجم،ص ٣١٧.

٩. الهجويري، علي بن عثمان، كشف المحجوب، انتشارات مركز تحقيقات فارسي إيران وباكستان، ص١٠٠.

١٠. نفس المرجع، ص ٣١٨. ٣٢٦.

١١. السيوطی، جلال الدين، الإمام، تاريخ الخلفاء، ص ٤٠٥.٤٠٦.

وعاش إمام باقر–رضي الله عنه– ٥٧ سنةً فی عصر خلفاء الأموي، وعاش فی عصرهٖ عشر من خلفاء بني أُميّة ومنها:

معاوية بن أبي سفيان ويزيد بن أبی معاوية ومروان بن حكم ومعاوية بن يزيد وعبد الملک بن مروان ووليد بن عبد الملک وسليمان بن عبد الملک وعمر بن عبد العزيز ويزيد بن عبد الملک بن مروان وهشام بن عبدالملک.

وهنالک روايات تدور حول وليد بن عبدالملک بأنّهٗ کان لا يحبّ أهل بيتِ رسولِ الله ﷺ عدواناً وظلماً وهٰکذا نجد بعض روايات حول سليمان بن عبدالملک،

لذلک سيد علي الهجويری. أشار إلٰی خليفةٍ من خلفاء ہٖ والأغلب هو أحد من هذين.(سيالوي)

۱۲. الهجويري، علي بن عثمان، كشف المحجوب، انتشارات مركز تحقيقات فارسي إيران وباكستان، ص ۱۰۰ .

۱۳. الهجويری، علي بن عثمان، كشف المحجوب،مطبوعه بسعی میاں شیخ خوشی محمد سجاده نشين ضريح سيد علی الهجويري بلاهور، ص ۱۰۰ .

۱۴. اقرب الموارد فی فصيح العربية والشوارد، منشورات مكتبة العظمٰی، قم، إيران.

۱۵. تاج العروس، دار إحياء التراث العربي، بيروت، لبنان، ۴/ ۵۵.

۱۶. وفيات الأعيان لابن خلكان، دار إحياء التراث العربي بيروت، لبنان،۴/ ۱۷۴ .

۱۷. عبد الرحمن الجامی، شواهد النبوّة،مترجم،ص ۳۱۷.

۱۸. ذهبی ،سیر أعلام النبلاء ، ۴/ ۴۰۴.

۱۹. أبو نعيم الأصفهاني،حلية الأولياء، ۳/ ۲۱۷ .

۲۰. ابن كثير، البداية والنهاية، ۵/ ۳۲۵.

۲۱. القرآن الكريم،۲/۲۵۶

۲۲. الهجويري، علي بن عثمان، كشف المحجوب، انتشارات مركز تحقيقات فارسي إيران وباكستان، ص ۱۰۰ .

۲۳. ذهبی ،سیر أعلام النبلاء، ۴/ ۵۴۷.

۲۴. ابن عساكر، تاريخ دمشق، ۲۹/ ۲۰۹. ۲۳۲ .

۲۵. نفس المرجع،ص ۲۱۹ .

۲۶. نفس المرجع، ص ۲۱۸ .

۲۷. ابن حجرالمكی، الصواعق المحرقة، ص ۱۲۰ .

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 31, Sr.No.79, 2010, pp 137 - 148

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۱، اپریل۔جون ۲۰۱۰ء، شمارہ ۷۹

قصۂ سوهنی و مهینوال سرودۂ دونی چند رایزاده

دکتر محمد ناصر☆ / دکتر محمد صابر☆☆

Abstract:

Duni Chand Raizadeh alias Bali was a Persian poet and historian who lived in 12th century A.H. No information is available about him from external sources. According to his own statement recorded in Kaigouhar Nameh, he was the son of Meghraj and his father died when he was only seven years old. His book on the Dynasty of Ghakkars, Kaigouhar Nameh, was complied, edited and published by Dr Muhammad Baqir but his 18 Mathnawis were left unpublished. One of those 18, the famous story of Sohni & Mahinwal has been edited over here which truely reflects his mastery over Persian language and poetry.

Key words: Sub-continent's Persian poetry, 12th century AH, Duni Chand Raizadeh, Sohni & Mahinwal.

دونی چند رایزاده معروف به نام بالی، تاریخ نویس و شاعر زبان فارسی شبه قاره، در سدۂ دوازدهم قمری می زیسته است. اسم پدرش میگهراج رایزاده بود. دونی چند در زمان کودکی اش، در سن هفت سالگی، پدرش را از دست داد. همان از دوران طفلگی به جهانگردی، علوم حرب و علم موسیقی علاقه داشت، و افزون بر آن در علم طب نیز دستی داشت و به معالجۂ مریضان و کسالتمندان نیز می پرداخت، اما در اواخر زندگی این شغل را ترك گفت و به خدمت سلطان دلاور خان گکهر (حك: ۱۱۱۷۔ ۱۱۳۹ ق) در آمد و به عنوان متصدی اش خدماتی انجام داد.(Duni Chand, 6-7)

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
☆☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

می نویسند که به سبب سختگیری مدار المهام به زندان افتاد و چندی بعد رهایی یافت و عازم بغداد شد، و دوازده سال در آن دیار بسر برد، و سپس به سرزمین پوتوهار، میهن خویش، باز آمد. در آن هنگام از شهرستانهای متعدد ایالت پنجاب از جمله مولتان، گجرات و سیالکوت دیداری کرد و در دوران همین سفر طولانی به ایالت جمون رسید (اسماعیل پور، ص ۲۰۹۵) و در دربار راجهٔ جمون وقتی که سخن از دلیری و شجاعت فرمانروایان آن دیار می رفت، دونی چند رایزاده به ستایش خانوادهٔ گکهران پرداخت، چون خودش را پرورده و نمکخوار ایشان می پنداشت.درباریان راجهٔ جمون در اثبات ادعای او، از وی شعر حماسه ای تقاضا نمودند، و دونی چند رایزاده در ظرف چند روز به زبان پوتوهاری نسب نامهٔ منظوم خانوادهٔ گکهران را سرود و توسط میر گل میراسی به دربار راجهٔ جمون فرستاد. نسب نامهٔ یاد شده به دست سلطان مبارز خان نیز رسید و مورد استقبال گرم وی قرار گرفت، و به تقاضای وی دونی چند به نوشتن 'کیگوهر نامه' پرداخت، و در سال ۱۱۳۷ ق آن را به پایان رساند. (سید عبد الله، ص۹۶؛ ظهور الدین احمد، صص ۴۳۳ ـ ۴۳۶، جلد سوم)

پس از درگذشت دونی چند رایزاده، فرزندش برجناتھ رایزاده و سپس نوه اش رتن چند رایزاده بر مطالب کیگوهر نامه افزودند، و چندی بعد نویسنده ای دیگر به نام عزت رای نیز بر متن کتاب افزود. (همانجا)

شادروان دکتر محمد باقر، استاد گروه فارسی در دانشکدهٔ خاور شناسی دانشگاه پنجاب لاهور پاکستان، 'کیگوهر نامه' را در سال ۱۹۶۵م توسط آکادمی ادبی پنجابی از لاهور منتشر کرد و در ضمن تدوین و تصحیح، چهار نسخهٔ خطی زیر را مورد نگاه قرار داد:

الف) نسخهٔ خطی موجود در کتابخانهٔ اندیا آفس در لندن، انگلستان

ب) نسخهٔ خطی موجود در موزهٔ بریتانیا در لندن، انگلستان

ج) نسخهٔ خطی موجود در کتابخانهٔ شخصی محمد گلزار خان

د) نسخهٔ خطی موجود در کتابخانهٔ شخصی غازی الدین حیدر

علاوه بر چهار نسخهٔ مزبور، در کتابخانهٔ مرکزی دانشگاه پنجاب لاهور، پنج نسخهٔ دیگر به شماره ایچ۔ ۵۲، ایچ ۵۳، ایچ ۵۴، ایچ ۵۵ و ایچ ۱۱۲، نیز در مجموعهٔ آذر نگهداری می شود (منزوی، الف، صص ۱۵۱۲ ـ ۱۵۱۳، جلد هشتم؛ همو، ب، صص ۴۸۷ ـ ۴۸۹، جلد دهم؛ نوشاهی، ص ۴۱۶)که هیچ کدام از آنها مورد استفادهٔ

دکتر محمد باقر قرار نگرفت. در میان نسخ یاد شده، دو نسخه به شماره ایچ ۵۵ و ایچ ۱۱۲ نسبت به نسخه های دیگر مفصلتر و افزون بر تاریخ منثور خانوادۂ گکهران مثنوی های بسیار جالب را نیز دارا ست. شایسته است ذکر شود که در سه نسخۂ دیگر هیچ مثنوی نیامده است. مثنوی ها به این ترتیب است:

(۱) در تعریف قلم (۲) در صفت کاغذ (۳) در شکوه و شکایت فلك (٤) حکایت یوسف و زلیخا (٥) قصۂ لیلی و مجنون (٦) قصۂ شیرین و فرهاد (۷) قصۂ وامق و عذرا (۸) قصۂ رسالو و کوکلا (۹) قصۂ سسی و پنون (۱۰) قصۂ هیر و ماهی (۱۱) قصۂ مرزا و صاحبه (۱۲) قصۂ بون و جلالی (۱۳) قصۂ سوهنی و مهینوال (۱٤) قصۂ مادهو و کام کندن (۱٥) قصۂ سورتهٔ و بیجا (۱٦) قصۂ رود و جلالی (۱۷) قصۂ مصری و ماهی (۱۸) قصۂ باغ این جهان. (منزوی، الف، ۱٥۱۳؛ ظهور الدین احمد، ٤۳۸،جلد سوم)

جالب است که در کیگوهر نامه، چاپ دکتر محمد باقر، ذکری از هیچ مثنوی نیست. مثنوی سوهنی و مهینوال، داستان معروف عاشقانۂ ایالت پنجاب که متعلق به منطقه ای در کنار رودخانۂ چناب است، در دو نسخۂ خطی در مجموعۂ آذر، به شمارۂ ایچ ۵۵ (نسخۂ بدل) و ایچ ۱۱۲ (نسخۂ اساس) آمده است. تفاوت در میان دو نسخۂ یاد شده بسیار کم به چشم می خورد. نسخۂ خطی به شمارۂ ایچ ۵۵ مشتمل بر ۷۹ برگ و نسخۂ خطی به شمارۂ ایچ ۱۱۲ دارای ۸۰ برگ است که در واقع در یك جلد اما در میان دو کتاب قرار گرفته است، از برگ شمارۂ ٦۹ آغاز می شود و به برگ شمارۂ ۱٤۸ به پایان می رسد. نسخۂ اول الذکر در سال ۱۸۸۸ بکرمی نگارش یافته است و سال کتابت نسخۂ مؤخر الذکر درج نیست.

خلاصۂ مثنوی:

مثنوی سوهنی و مهینوال با مدح عشق و ستایش سخن آغاز می شود و شاعر با استفاده از تشبیهات متداول و استعارات رایج عاطفۂ عشق، گوهر سخن و زیبایی سوهنی را می ستاید. عشق فنا ناپذیر مهینوال در ته قلب سوهنی جایگزین می شود. محبوب وی در آن طرف رودخانه بسر می برد، و در میان هر دو دریای پُرهول حایل است، اما عشق بی درنگ و جسور مشکلات و مصائب را در خور اعتنا قرار نمی دهد. او در عشق بیتاب می گردد و عنان قرار و اختیارش را از دست می دهد و از نیکنامی خانواده را در خاطر نمی آورد. در شبهای تیره و تار با وجود خطر جان، به خاطر دیدار

محبوب روی سبوی سفالین رودخانهٔ مواج را عبور می کند. شبهای تاریك و توفان باد و باران را همانند بهاران می پندارد. اما از قضا کسی از قضیه آگاه می گردد و سبوی شکسته را به جای سبوی ثابت می گذارد. سوهنی، ناآگاه، روی سبوی شکسته به عبور رودخانه می شتابد، اما در میان قعر دریا سبو می شکند و سوهنی غرق می شود، و هیچ خبری از آن عاشق بدبخت باز نمی آید.

متن اصلی:

غرقاب گرداب قهر ذوالجلال سوهنی و مهینوال

۱. چون تب به شوق گشت رقاص
زد غوطه به بحر دل چو غواص (۱)
گوهر سخن از فکر کف آورد
ناسفته ز صدف در صف آورد
هر در که به تاب آبدار است
منسلك به سلك نامدار است
در کوش کتاب چون رسیدند
با رشته حساب آرمیدند
۵. گر مشتری آن بود به صد ذوق
مشتاق جمالش از سر شوق
چون بکر عروس رو نمایند
از درج سطر زبان گشایند
گویند ز بی دهن سخن ها
سازند پُر از گهر دهن ها
خود گر چه ز سلك بر نخیزند
صد سلك ولی ز کلك ریزند

زان سلك چو گوهری فشانند
چون دُر به زبان جهان نشانند
اکنون همه آن گهر به مجمع
گشتند به سوهنی مرصع
آن دُر خوشاب ناب ذاتش
بیتاب ولی به تاب آتش
عشقش چو شرار شوق وا کرد
چون دُر به صدف [به] سینه جا کرد
هر دم به گداز و سوز بودی
در کوره چو بوته روز بودی
غوطه زن بحر بی نشان شد
جانانش دور بهر جان شد
شد کشتی صبر تخته تختش
آن تخت چو تخته کرد تختش
از جوش و خروش سر و دستان (۲)
بی هوش و خموش همچو مستان
محرم ز تنش و خسته حالش
مرهم بر ریش مهین والش
او بود ولی به دشت و صحرا
دستش نرسید با تمنّا
یك بود میان هر دو دریا
موجش بشتافت (۳) با ثریّا
صد فتنه درو اگر چه هایل
آن را چه خطر چو گشت مایل

در دیده نهنگ گر چه عرض است
رفتن به دو عین عین فرض است
چو سوهنی شد به عشق بیتاب
از تاب دلش تب است در آب
چون آب روان شده قرارش
از دست برفت اختیارش
بر باد ز نیکو نام وز جا
بر باد نمود خانه بر پا
۲۵. در روز نمی شدش میسّر
می رفت به شب ز پا و از (٤) سر
همره بگرفت یك سبویی (٥)
می یافت طفیل او فتوحی
بنشست به پشت او چو کشتی
با پشتی دوش کرد کشتی
آن تنگ ولی حباب آسا
آساس به آب ساخته جا
هر شب به دلش همین صلاحان
چون بازد و با داس ملاحان
۳۰. با محنت آب چون صبوحی (٦)
هر شام سیه شدش صبوحی
پرهیز چرا کند ز ناله
صد ناله روان به زور ناله

غرقاب به عشق بی سواحل
بر آب نمود طی مراحل
هر موج چو زلف تار می دید
از شوق به هیچ دست پیچید
تاریك شبان به باد و باران
در چشمش بود چون بهاران
۳۵. دیوانه دلش دلاوری کرد
مردانه صفت شناوری کرد
در ورطه خطر نه کاهلش بود
هر کام نهنگ ساحلش بود
بر همّت آن زنی است یاور
در وحدت گر شدی شناور
گوهر معنی بجست می یافت
از چست کمر درست می یافت
گر پاك ز خاك روی بردی
با چوگان عشق گوی بردی
٤٠. گر گام (۷) به صدق ره نهادی
صد پرده ز دیده بر گشادی
لیکن نفس است هر بینی را
لیکن چه گناه سوهنی را
یك شب به قضا فتاد کارش
با خام سبوی (۸) چون دمارش

اجلش چو به او تیّار گردید
نادیده بر او سوار گردید
دو نیم شد آن به نیم راهی
از بیم زد آن سقیم آهی
دو لخت دلش به سخت جان شد
جان لرزه کنان چو ناتوان شد
چون موم سبوی (۹) خام برداشت
با آتش شوق تیز بگداخت
در آب فتاد هر سفالش
بیتاب و خراب خط و خالش
بیچاره به روی موج آمد
هر موج پی اش چو فوج آمد
از برق فنا چو عرق گردید
از پا تا فرق [چو] غرق گردید
از اوج به قعر موج در پیچ
شد هیچ خبر نیامدش هیچ
این گرگ سپهر تیز دندان
بی مهر به حال درد مندان
شد گنجفه باز بهر زرقش
هر عضو نمود ورق ورقش
با خواهش قدرت الٰهی
شد طعمه دهان مور و ماهی

دریای عمیق پُر ز گرداب
عشق است که شد هزار غرقاب
۵۵. بحری است عمان کناره اش نیست
قصری است عیان مناره اش نیست

نگاهی به ویژگی های هنری:

☆ نگاه کنید، بیت ۱: طبع؛ دل: تشخیص

☆ نگاه کنید، بیت ۲: گوهر سخن: تشبیه بلیغ؛ صدف، صف؛ کف، صف:جناس

☆ نگاه کنید، بیت ۳: تاب، آب؛ دُر، دار: جناس

☆ نگاه کنید، بیت ۵: تکرار صامت "ش" موسیقی ایجاد می کند.

☆ نگاه کنید، بیت ٦: سخن [مشبه]، بکرعروس [مشبه به]: تشخیص

☆ نگاه کنید، بیت ۷: گویند ز بی دهن سخن ها: متناقض نمایی

☆ نگاه کنید، بیت ۸: سلك، کلك: جناس

☆ نگاه کنید، بیت ۱۱: دُر خوشاب ناب: تشبیه به سوهنی؛بیتاب، به تاب: جناس

☆ نگاه کنید، بیت ۱۲: عشقش، شرار، شوق: تکرار صامت "ش"؛

شرار شوق: تشبیه بلیغ؛ عشق به دُر، و صدف به سینه تشبیه داده شده است.

☆ نگاه کنید، بیت ۱۳: سوز، روز: جناس

☆ نگاه کنید، بیت ١٤: تکرار صامت "ش"

☆ نگاه کنید، بیت ۱۵: تکرار صامت "ش، خ، ت"،کشتی صبر: تشبیه بلیغ؛

تخت، تخته: جناس

☆ نگاه کنید، بیت ١٦: تکرار صامت "ش، س"

☆ نگاه کنید، بیت ۱۸: به تمنا دست نرسیدن: کنایه

☆ نگاه کنید، بیت ۲۱: عین، عین: جناس

☆ نگاه کنید، بیت ۲۲: تب، تاب، آب: جناس

☆ نگاه کنید، بیت ۲۳: قرار: مشبه، آب: مشبه به؛ اختیار از دست رفتن: کنایه

☆ نگاه کنید، بیت ۲۵: روز، شب؛ سر، پا: تضاد

☆ نگاه کنید، بیت ۲۷: کشتی، کُشتی، پُشتی: جناس

☆ نگاه کنید، بیت ۲۸: تنگ: مشبه، حباب: مشبه به، آسا: ادات تشبیه؛ آسا، آساس: جناس

☆ نگاه کنید، بیت ۳۰: شام، صبوح: صنعت تضاد

☆ نگاه کنید، بیت ۳۳: موج: مشبه؛ زلف تار: مشبه به؛ دست به هیچ پیچیدن: کنایه

☆ نگاه کنید، بیت ۳٤: تاریك شبان و باد و باران: مشبه؛ بهاران: مشبه به

☆ نگاه کنید، بیت ۳۵: در مصراع اول، تکرار صامت "د"

☆ نگاه کنید، بیت ۳٦: کام نهنگ: مشبه؛ ساحل: مشبه به

☆ نگاه کنید، بیت ۳۸: گوهر سخن: تشبیه بلیغ

☆ نگاه کنید، بیت ۳۹: پاك، خاك؛ رُوی، گوی: جناس؛ چوگان عشق: تشبیه بلیغ

☆ نگاه کنید، بیت ٤۰: تکرار صامت "د" در مصراع دوم

☆ نگاه کنید، بیت ٤۱: نفس است هر بینی را: کنایه

☆ نگاه کنید، بیت ٤۲: اجل: تشخیص

☆ نگاه کنید، بیت ٤٤: نیم، بیم: جناس

☆ نگاه کنید، بیت ٤٦: آتش شوق: تشبیه بلیغ

☆ نگاه کنید، بیت ٤۷: تکرار صامت "خ" در مصراع دوم

☆ نگاه کنید، بیت ٤۸: موج: مشبه؛ فوج: مشبه به، و نیز جناس

☆ نگاه کنید، بیت ٤۹: برق فنا: تشبیه بلیغ؛ فرق، عرق، غرق: جناس

پا، فرق: تضاد

☆ نگاه کنید، بیت ۵۰: اوج، موج؛ پیچ، هیچ: جناس

☆نگاه کنید، بیت ۵۱: گرگ سپهر تیز دندان: استعاره مکنیه

☆ نگاه کنید، بیت ۵۲: ورق، ورقش، زرقش: جناس

☆ نگاه کنید، بیت ۵۵: عشق در مصراع اول به بحر بی کنار و در مصراع دوم به قصر بی منار همانند قرار گرفته است.

یاد داشتها:

(۱) نسخه ب: به بحر عشق چو غواص

(۲) هر دو نسخه: سر دستان

(۳) هر دو نسخه: می تافت

(٤) هر دو نسخه: وز

(٥) هر دو نسخه: سبوحی

(٦) هر دو نسخه: به صبوحی

(۷) هر دو نسخه: قدم

(۸) هر دو نسخه: سبوح

(۹) هر دو نسخه: سبوح

کتابشناسی:

اسماعیل پور، محمد (۱۳۷۵ش) کیگوهر نامه؛ دانشنامۀ ادب فارسی در شبه قاره، وزارت فرهنگ و ارشاد اسلامی، تهران.

سید عبدالله (۱۳۷۱ش) ادبیات فارسی در میان هندوان؛ مترجم دکتر محمد اسلم خان، موقوفات دکتر محمود افشار، تهران.

ظهور الدین احمد (۱۹۹۰،۱۹۸۵،۱۹۷۷م) پاکستان مین فارسی ادب ، ج ٥، ٤

و ۳، ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاهور.

منزوی، احمد (الف) (۱۹۸۷م) فهرست مشترك نسخۂ خطی فارسی پاکستان،جلد هشتم، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد.

همو (ب) (۱۹۸۷م) فهرست مشترك نسخۂ خطی فارسی پاکستان،جلد دهم، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد.

نوشاهی، خضر عباس (۱۹۸٦م) فهرست نسخه های خطی فارسی کتابخانۂ دانشگاہ پنجاب لاهور "گنجینۂ آذر"، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد.

Duni Chand Raizadeh (1965) Kaigohar Nameh, Edited by Muhammad Baqir, Punjabi Adabi Academy, Lahore.

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 31, Sr.No.79, 2010, pp 149- 170

مجلّہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۱، اپریل۔جون ۲۰۱۰ء، شمارہ ۷۹

(کشمیر.....اسلامی تاریخ کے تناظر میں)

(۱۳۲۰ء-۱۸۱۹ء)

ڈاکٹر خواجہ زاہد عزیز☆

Abstract:

Islam introduced in Kashmir by the efforts of central Asian Preachers. Shahmeri, Chak, Mughal and Afghan dynasties ruled over Kashmir for atleast five years. During the Muslim rule, Kashmir progressed much in cultural, Social and educational fields as well as lost her Freedom and sovereiginty. The Muslim rule brought to an end in Kashmir by the conspiracy of the East India company. The article is about all above mentioned facts.

کشمیر تقریباً ساڑھے چار ہزار سال ہندو راجوں کی دسترس میں رہا ہے۔ ان راجاؤں نے اسے ایک منفرد حیثیت بخشی۔ ہندو مہاراجوں کے عہد میں وادی کو متعدد مرتبہ عروج و زوال کا سامنا کرنا پڑا، عظیم فاتح ہندوستان محمود غزنوی نے ہندو عہد حکومت کے دوران ہی کشمیر پر دو حملے کیے لیکن ناکامی سے دوچار ہوا۔ یہ بات اس چیز کی عکاسی کرتی ہے کہ ہندو حکمرانوں کو اپنے ملک کشمیر سے بے پناہ محبت تھی۔ ہندو حکمرانوں نے ان حملوں کے بعد اپنے آزاد و خودمختار وطن کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کے لیے ایک پالیسی بنالی تھی جس کے بارے میں البیرونی رقمطراز ہیں:

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ کشمیریات، اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب، لاہور۔

> In former times they used to allow one or two foreigners to enter their country, particularly the Jews, but at present they do not allow even a Hindu whom they did not know personally to enter, much less other people.(1)

لیکن ہندو مہاراجوں کی یہ پالیسی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئی کیونکہ وقت کی تیز رفتار کے ساتھ ساتھ ملکی حالات میں بھی تبدیلیاں رُونما ہونے لگیں۔ اسلامی ممالک کی بڑھتی ہوئی طاقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندو حکمرانوں نے ان ممالک سے تعلقات استوار رکھنے میں ہی غنیمت جانی اور مسلمانوں کے کشمیر میں داخلے پر کوئی پابندی نہ لگائی۔

کشمیر میں باقاعدہ اسلام کا آغاز تو بہت بعد میں ہوا لیکن تاریخی کتب سے ہندو عہد میں بھی مسلمانوں کی اکثریتی آبادی کا پتہ چلتا ہے۔

کشمیر میں اسلام کی تبلیغ کا آغاز تاجروں، عالموں اور بزرگان دین کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ وادی کشمیر میں اسلام کو پھیلانے میں نیزوں، تلواروں یا قتل و غارت گری کا قطعاً کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ کشمیر کے تعلقات وسط ایشیا کے ساتھ بالخصوص اور عرب ممالک کے ساتھ بالعموم اچھے رہے ہیں۔ کشمیر کی وسط ایشیائی اور عرب ممالک کے ساتھ تجارت بہترین مراسم کو فروغ دینے کا ایک اہم ذریعہ تھی۔ وسط ایشیا کے گھوڑوں کی کشمیر میں بہت زیادہ مانگ تھی اور گھوڑوں کا کاروبار وسط ایشیا کے مسلمان تاجروں کے ہاتھوں میں تھا جو اکثر و بیشتر کشمیر جایا کرتے تھے۔ اس تجارت کے ذریعہ بھی اسلام کی تبلیغ کے اثرات وادی کشمیر پر مرتب ہوئے۔(۲)

کشمیر کے ہندو حکمرانوں نے عرب ممالک کے ساتھ تعلقات صرف عربوں کے ڈر اور خوف کی وجہ سے استوار کیے۔ کیونکہ عربوں نے کشمیر پر تین حملے کیے۔ پہلا حملہ خلیفہ ہشام (۷۴۳ء-۷۳۴ء) دوسرا حملہ محمد بن قاسم (۷۱۱ء-۷۱۳ء) اور تیسرا حملہ خلیفہ منصور (۷۵۴ء-۷۵۴ء) کے عہد میں ہوا اگرچہ عربوں کے تینوں حملوں سے کشمیر محفوظ رہا(۳) محمد بن قاسم نے جب سندھ کو فتح کر کے اسلام کی روشنی سے متعارف کروایا تو اُس وقت کشمیر پر راجہ

جیاپیڈا کی حکمرانی تھی جب راجہ کشمیر کو محمد بن قاسم کے حملے کی خبر ہوئی تو اُس نے چینی بادشاہ سے کشمیر کو محمد بن قاسم کے حملے سے بچانے کے لیے مدد طلب کی، مگر خلیفہ سلیمان نے جلد ہی محمد بن قاسم کو واپس بُلا لیا۔ اس طرح کشمیر تسخیر ہونے سے بچ گیا۔ البتہ محمد بن قاسم کے قافلے کا ایک سپاہی حمیم بن سامہ کسی طرح کشمیر میں داخل ہوا اور اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا۔ اسے کشمیر میں پہلا باقاعدہ مبلغ اسلام مانا جاتا ہے۔ غلام حسن تسکین لکھتے ہیں:

۷۱۲ء یَس کُیت چُھ جواں سال عرب فاتح محمد بن قاسم راز دَاہرس ہارناوتھ سندھ فتح کران، حمیم بن سام اَکھ عرب مُسلمان چُھ أتھی وقتس یور کشُیر واتان تہ ییتہ گوڈنچ مشید تأمیر کران۔ اِمہٰ علاوہ کور اِیمَن کشیر منز اسلا مک پرچارتہ(۴)

ترجمہ: ''۷۱۲ء میں جواں سال محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کر کے راجہ داہر کو شکست دی۔ حمیم بن سامہ ایک عرب مسلمان کسی نہ کسی طرح کشمیر پہنچا اور یہاں پہلی مسجد تعمیر کروائی۔ اس کے علاوہ کشمیر میں اسلام کا پرچار بھی کیا''۔

وادی کشمیر میں اسلام کے اثرات بتدریج مرتب ہو رہے تھے۔ لیکن ابھی تک باقاعدہ تبلیغ اسلام کی ابتدا نہیں ہوسکی تھی۔ اُس کی وجہ شاید یہ تھی کہ کشمیر کے حکمران کُلی طور پر غیر مسلم تھے اور وادی کو ابھی تک باقاعدہ طور پر کسی مسلمان فاتح نے تسخیر بھی نہیں کیا تھا، لیکن گاہے بگاہے تجارت کے ذریعہ، سیر وسیاحت کے دوران یا پھر کسی فوجی مہم کے دوران کسی مرد مجاہد کے ہاتھوں کشمیر اسلام کی کرنوں سے منور ہوتا رہا۔ محمود غزنوی نے کشمیر پر دونوں حملے راجہ سنگرام کے عہد حکومت کے دوران (۱۰۱۳ء اور ۱۰۲۳ء) میں کیے۔ ان دونوں حملوں میں ناکامی کے باوجود اس کے کچھ سپاہی کسی نہ کسی طرح کشمیر وارد ہوئے اور انہوں نے بھی کشمیر میں دین اسلام کی تبلیغ کی۔ غلام حسن تسکین لکھتے ہیں:

محمد بن قأسِم ہنُدِ حَملَه پَته چُھ مُسلمان بادشاہَو أنُدر محمود غزنوی سُنُد حَمَله مشہور۔ مگر سُه ہیوک نه لوہَر کوٹ قِله یپور تُرتھ۔ اِیمسُند دوشونی حَملَن دوران رودی کینه کینه سِپاه ییتی۔ ته یہندِ ذرٔی یهِ تهِ اوس اِسلامَس کُن لؤکَن مأل پھِرنه یوان۔[۵]

ترجمہ: ''محمد بن قاسم کے حملے کے بعد مسلمان بادشاہوں میں محمود غزنوی کے حملے بہت مشہور ہیں۔ مگر وہ لوہر کوٹ قلعہ ہی کو فتح نہ کر سکا۔ اس کے دونوں حملوں کے دوران کچھ سپاہی یہیں پر رہ گئے اور اِن کے ذریعہ بھی اسلام کی طرف لوگوں کا رُجحان بڑھا''۔

کشمیر اور وسط ایشیا ممالک کے مابین تعلقات نہایت خوشگوار رہے ہیں اور وادی کشمیر میں اسلام کی اشاعت کا باقاعدہ آغاز بھی وسط ایشیا کے علماءصوفیا اور اولیائے کرام کے توسط سے ہوا۔ وسط ایشیا کے پہلے صوفی بزرگ سید شرف الدین عرف بُلبل شاہ جو منگولوں کے خوف سے ایک ہزار پناہ گزینوں کے ساتھ ترکستان سے کشمیر آئے۔ اس وقت کشمیر پر لوہر خاندان کے جانشین راجہ سہدیو کی حکومت تھی جو بزدل اور عیاش حکمران تھا۔ ان تمام خامیوں کے باوجود وہ ''مہمان نوازی'' کے وصف سے بھی آراستہ تھا۔ اُس کے عہد میں جتنے بھی مسلمان کشمیر وارد ہوئے سب کو اُس نے جاگیریں عطا کیں اور کشمیر میں رہنے کی اجازت دی۔ اسی حکمران (سہدیو) نے بلبل شاہ کو بھی کشمیر میں خوش آمدید کہا۔ جی ایم ڈی صوفی لکھتے ہیں:

Bulbal Shah is stated to have visited Kashmir first in the time of Raja Shuhadeva, the predecessor of Rinchan.[6]

حضرت بُلبل شاہ ہی کی اسلامی تعلیمات کی بدولت کشمیر اسلام کی روشنی سے متعارف ہوا۔ چودھویں صدی کے آغاز میں منگول سردار ذولچو اور اُس کے ساتھیوں کے حملے کی تاب نہ لا کر راجہ سہدیو اور اس کے سرکاری اہلکار کشمیریوں کو منگولوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر گئے تو اُن کے جانے کے بعد کشمیر کے تخت کا سہرا ایک تبّتی شہزادے لاہ چن نگیالبو رنچن کے سر باندھا

گیا(۷) یہ تبتی شہزادہ راجہ سہدیو کے عہد میں تبت سے کشمیر آیا اور مہاراجہ کشمیر نے اسے بھی لار کے علاقہ میں جاگیر عطا کی۔ رنچن شاہ بُدھ ازم کا پیروکار ہونے کے ناطے ابھی تک دین اسلام سے متعارف نہیں ہوا تھا لیکن بہت جلد سید بلبل شاہ کے ہاتھوں مسلمان ہوا اور اپنا نام بدل کر صدرالدین رکھا۔ اس کے اسلام قبول کرتے ہی ہزاروں لوگوں نے اسلام قبول کیا(۸) اور کشمیر کے اسی حکمران نے ۱۳۲۰ء میں کشمیر میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس پہلے مسلمان بادشاہ نے بلبل شاہ کے لیے دریائے جہلم (مقبوضہ کشمیر) کے کنارے ایک خانقاہ بھی تعمیر کروائی جس کے ساتھ مسافر خانہ اور مسجد بھی تھے۔ یہ کشمیر کی پہلی درس گاہ تھی(۹)۔ صدرالدین کا دور حکومت تقریباً تین سال پر محیط ہے اور اس بادشاہ کی وفات ۱۳۲۳ء میں ہوئی اور سرینگر ہی میں دفن ہوئے۔

بادشاہ کی وفات ایک سانحہ سے کم نہ تھی۔ صدرالدین کی وفات سے کشمیر میں اشاعت اسلام کا کام کافی حد تک متاثر ہوا کیونکہ بادشاہ کی وفات کے بعد اُس کی بیوہ کوٹارانی نے اپنے بیٹے حیدر کی کمسنی کی اوٹ میں کشمیر حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ کوٹارانی نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا اور نہ اُس کے پاس اسلام کے لیے ہمدردانہ جذبات و احساسات تھے۔ اُس نے سہدیو کے بھائی ادیان دیو سے شادی رچالی۔ جس سے کشمیر میں صدرالدین کی قائم کردہ اسلامی حکومت کو ایک دھچکا لگا۔

سلطان صدرالدین نے اپنے تین سالہ دور حکومت میں کشمیر کے حالات درست کر لیے تھے۔ مگر اُس کی وفات کے بعد مُلک کشمیر کے حالات ابتر ہو گئے تھے۔ ملکہ کوٹارانی کا خاوند ادیان دیو جس نے کشمیر پر تقریباً پندرہ سال حکومت کی۔ اپنے بھائی سہدیو کی طرح بالکل نکما اور بزدل ثابت ہوا۔ اس کی حکومت کے دوران کشمیر میں افراتفری کا سماں تھا۔ نظم ونسق نام کی کوئی چیز نہ تھی(۱۰)۔ جس کی وجہ سے بیرونی حملہ آوروں کی حوصلہ افزائی ہوئی اور ایک تاتاری سپہ سالار ارون نے کشمیر پر چڑھائی کر دی۔ بزدل ادیان دیو نے ایک مرتبہ پھر راہ فرار اختیار کی۔ لیکن ملکہ کشمیر کوٹارانی نے عوامی حمایت اور شاہ میر جو کہ اُس کی فوج کا سپہ سالار تھا، کی بہادری اور جوانمردی کے ذریعے تاتاری سپہ سالار ارون کا حملہ ناکام بنا دیا۔

تاتاری سپہ سالار کے حملے کو ناکام بنانے میں شاہ میر کو اپنی ذہانت اور قابلیت آزمانے کا بھرپور موقع ملا۔ اُس نے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا، جس کا خدشہ ملکہ کشمیر کوٹا رانی کو لاحق ہوا۔ ادیان دیو کی وفات کے بعد کوٹہ رانی کشمیر کی خودمختار ملکہ قرار پائی تھی۔ مگر اُسے شاہ میر کی شہرت ایک

آنکھ بھی نہیں بھاتی تھی۔ کیونکہ شاہ میر ایک مسلمان تھا اور کوٹہ رانی ایک غیر مسلم تھی اور وہ قطعاً یہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک مرتبہ پھر ہندو حکومت کو زوال آئے اور اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی جائے۔ کیونکہ ادیان دیو اور کوٹہ رانی کی حکومتوں کے دوران اسلام کی اشاعت و ترویج کا کام مکمل طور پر رُک چکا تھا اور صرف اب ایک ہی شخصیت تھی جو کہ ہندو حکومت کے اثر کو ختم کر کے اسلام کی داغ بیل ڈال سکتی تھی اور وہ تھا شاہ میر۔

ملکہ کوٹہ رانی اپنے ہندو اقتدار کو بچانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی اور مختلف سازشوں کے ذریعے شاہ میر کو نیچا دکھانے لگی لیکن خدائے وحدہ لاشریک نے اس مردِ مومن سے اپنے دین کی سربلندی کا کام لینا تھا۔ اس لیے کوٹہ رانی کی ساری کاوشیں جو کہ اُس نے ہندو اقتدار کو بچانے کے لیے کی تھیں، سب کی سب بیکار ثابت ہوئیں اور شاہ میر کے سامنے اُس کے سارے اوچھے ہتھکنڈے اُلٹ گئے۔ محی الدین حاجنی لکھتے ہیں:

سُلطان صدرالدین رینچن شہس پتہ اگرچہ کوٹّہ رانہ تہ ادھون دیون ہندو اقتدار قائم تھاؤنہ خأطرہ کأفی کوشش کرے یہِ۔ اماپوز شہمیرس مُقابلہ چوُل نہ یمن کینُہ۔(۱۱)

ترجمہ: ''سُلطان صدرالدین رنچن شاہ کے بعد کوٹہ رانی اور ادیان دیو نے ہندو اقتدار قائم رکھنے کی بہت کوشش کی مگر شاہ میر کے مقابلے میں انہیں اتنی ہمت نہ ہوئی۔''

کوٹہ رانی، جب اپنے تمام تر منفی پروپیگنڈوں میں شاہ میر کے مدمقابل ناکام و نامراد ہوئی تو اُس کے پاس شاہ میر سے شادی رچانے اور اُسے کشمیر کا حکمران تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ اس لیے کوٹہ رانی نے شاہ میر سے شادی کر لی مگر جلد ہی خودکشی کر لی اور اس طرح سے کشمیر میں ہندو دور اختتام پذیر ہوا اور ۱۳۳۹ء میں شاہ میر نے کشمیر میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

کشمیر میں اسلامی حکومت کا آغاز تو رنچن شاہ کے قبول اسلام سے ہی ہوگیا تھا لیکن سولہ سال کے بعد جب ہندو حکومت روبہ زوال ہوئی تو کشمیر میں باقاعدہ طور پر پہلی اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا سہرا سوات کے باشندے شاہ میر کو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں جے این گہنار لکھتے ہیں:

شاہ میر چُھ ۱۳۳۹ء منز کشیر ہندِس تختسَ پیٹھ بیہان

تہ اَتی پیٹھ چُھ کشیر منز مسلمان راجُک رٔسلابہ سَپدان۔(۱۲)

ترجمہ: ''شاہ میر ۱۳۳۹ء میں کشمیر کے تخت پر بیٹھتا ہے اور اس طرح سے کشمیر میں مسلمان راجوں کا ایک دور شروع ہوتا ہے۔''

شاہ میر نے ۱۳۳۹ء میں کشمیر کا تخت سنبھالا اور شاہ میری خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس خاندان نے ۱۵۵۴ء تک کشمیر پر حکومت کی۔ اس خاندان نے نامی گرامی سلاطین پیدا کیے جنہوں نے کشمیر کو تقریباً ہر میدان میں عروج بخشا۔ سلطان شمس الدین المعروف شاہ میر ایک عادل، وسیع القلب اور نرم دل حکمران سرزمین کشمیر کے لیے ثابت ہوا۔ جس نے مشہور صوفی بزرگ میر سید علی ہمدانی اور اُن کے سینکڑوں رفقائے کار کی تبلیغ، انسان دوستی اور دیانت و شرافت کے ذریعے ظلم و ستم کے پنجوں میں جکڑے ہوئے کشمیریوں کو جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل کیا(۱۳)۔

کشمیر میں اسلامی حکومت کا آغاز نہایت مبارک اور حوصلہ افزا تھا۔ اگرچہ شاہ میر کا دور حکومت بہت مختصر (۱۳۳۹ء-۱۳۴۲ء) تھا لیکن اُس کی آمد نے کشمیر کے گھائل وجود پر ایک تسکین بخش مرہم کا کام دیا۔ اس نے عوام سے ہمدردانہ، منصفانہ اور روشن خیالی پر مبنی حکمت عملی اختیار کی۔ اُس نے محصولات میں کمی کی اور مساوات، عدل و انصاف کو اپنا شعار بنایا۔ اُس نے ایک یادگار کام بھی کیا یعنی ایک نیا کشمیری کیلنڈر رائج کیا(۱۴) جو تین سو سال تک قائم رہا لیکن ۱۵۸۶ء میں کشمیر جب مغل سلطنت کا صوبہ قرار پایا تو اس کشمیری کیلنڈر کو بھی ختم کر دیا گیا۔

سلطان شمس الدین کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں میں ایسے نایاب جواہر پیدا ہوئے جنہوں نے کشمیر کو نہ صرف عسکری بلکہ تعلیم، زراعت، فنون لطیفہ، صنعت و حرفت اور دیگر میدانوں میں بھی بے پایاں ترقی عطا کی۔ سلطان شہاب الدین نے بالخصوص عسکری اعتبار سے کشمیر کو یقیناً عروج بخشا۔ جی ایم ڈی صوفی رقمطراز ہیں:

> It was the second time in history that Kashmiris proved their military prowess. Shahab-ud-Din in Kashmir history figures next to Lalitaditya Mukhtapida.(15)

سلطان شہاب الدین نے ہر میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس نے نہ صرف فتوحات میں کمال حاصل کیا بلکہ کشمیر کی ثقافت کو محفوظ کرنے اور اسے ترقی دینے کے لیے بھی بہت کام کیا۔ سلطان علماء وفضلاء کا بہت قدردان تھا۔ اس نے رفاہ عامہ کے کاموں میں مذہب وملت کا کوئی فرق روا نہ رکھا۔ بلکہ اُس کے عہد میں ہندو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ اُس نے کشمیر میں لباس، تعمیرات اور معاشرے میں کافی تبدیلیاں کیں (۱۶) سلطان شہاب الدین جیسے عادل اور بہادر جرنیل صحیح معنوں میں کشمیر کا قیمتی اثاثہ تھے۔ سلطان ایک ایسا گوہر نایاب تھا جس کی مدح سرائی میں عالم اسلام کے راہنما اور پاکستان کے قومی شاعر ڈاکٹر علامہ اقبال بھی پیچھے نہ رہ سکے۔ علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں اس عظیم انسان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

عمرہا گل رخت بر بست و کُشاد
خاک ما دیگر شہاب الدین نزاد(۱۷)

ترجمہ: ''کئی صدیوں پھول رخت باندھتے اور کھولتے رہے مگر
ہماری سرزمین نے دوسرا شہاب الدین پیدا نہیں کیا۔''

سلطان شہاب الدین نے اُنیس سال کشمیر پر حکومت کی۔ اس عظیم فاتح کی وفات کے بعد قطب الدین کشمیر کا بادشاہ بنا۔ یہ شہاب الدین کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس بادشاہ نے وادی میں کئی دینی درسگاہیں اور مکتب قائم کیے۔ اس کے عہد کی تین درسگاہوں کو نمایاں شہرت حاصل ہوئی (۱۸) اُن میں سرفہرست سلطان کی اپنی قائم کردہ درسگاہ تھی جو اُس نے خود دارالحکومت قطب الدین پورہ میں تعمیر کرائی۔ سلطان قطب الدین علماء وفضلاء کا قدردان تھا۔ وہ خود ایک اچھا شاعر تھا۔ اُس نے اپنی انصاف پسندی کی وجہ سے عوام کے دل جیت لیے تھے۔ محبّ الحسن رقمطراز ہیں:

He was not only an able ruler, but a man of culture, a poet and a patron of learning.(19)

سلطان قطب الدین کی وفات کے بعد اُس کا جانشین سلطان سکندر مسندِ کشمیر پر بیٹھا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں عقائد اسلام اور ارکان اسلام کی مکمل طور پر پابندی کی اور اُن تمام رسوم و رواج و بدعات کو یکسر ختم کر دیا جو شریعت اسلام کے منافی تھیں۔ سلطان ایک نیک، باکردار، بہادر اور فیاض حکمران تھا۔ اس کی فیاضی اور علم دوستی کا چرچا سُنتے ہی عراق، خراسان اور ماوراء النہر سے علماء وفضلاء اُس کی زیرنگرانی روزگار کے حصول کی غرض سے کشمیر

وارد ہوئے (۲۰) جس سے کشمیر میں اسلامی علوم کی ایسی عظیم الشان ترویج ہوئی کہ وادی کشمیر عراق اور خراسان کا نمونہ بن گئی۔ اُس نے دین اسلام کی سربلندی اور عظمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے وادی میں مساجد، خانقاہیں اور دینی مدارس کی داغ بیل ڈالی۔ اُس نے کفار کی بہت سی عبادت گاہوں کی تخریب کی اور بہت سارے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ اُس نے سکندر پورہ میں بت خانہ گرانے کے بعد وہاں پر ایک جامع مسجد تعمیر کی۔ اس کے علاوہ سرینگر کی دو اہم یادگاریں بھی اُسی کی تعمیر کردہ ہیں جس میں سے پہلی یادگار خانقاہ مُعلیٰ اور اُس کے ساتھ جامع مسجد اور دوسری موضع ترال کی خانقاہ فیض پناہ (۲۱)۔ رب ذُوالجلال نے شاید سُلطان سکندر سے دین اسلام کی مختصر ہی سی خدمت لینا تھی اسی لیے یہ بادشاہ عین عنفوان شباب میں یعنی تیس سال کی عمر میں راہی ملک عدم ہوا۔

اُس کے جانشینوں میں سے قدرت نے ایک ایسا نابغہ روزگار پیدا کیا جس نے نہ صرف اپنے حسن سلوک، رواداری اور پیار و محبت سے دل فگار کشمیریوں کے زخموں پر مرہم رکھا بلکہ جنت نظیر کشمیر کو بھی ایک بار پھر بام عروج پر پہنچایا۔ سلطان زین العابدین سلطان سکندر کا بیٹا تھا جس کا اصل نام شاہی خان تھا۔ اہل کشمیر اسے ''بڈ شاہ'' یعنی بڑا بادشاہ کہتے تھے۔ یہ ۱۴۲۰ء میں کشمیر کی حکومت کا وارث بنا اور نصف صدی حکومت کی۔ زین العابدین نے اپنے پچاس سالہ دور میں کشمیر میں مختلف علوم و فنون، شعر و ادب، صنعت و حرفت، تجارت، مذہبی رواداری، عدل و انصاف، بیرونی روابط اور امن و خوشحالی کو فروغ بخشا (۲۲) زین العابدین کا عہد کشمیر کا سنہری ترین دور تصور کیا جاتا ہے۔

زین العابدین کے پچاس سالہ عہد میں عوام امن و سکون کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس کی رعایا اس کی بڑی وفادار تھی۔ وہ ایک فیاض اور سخی بادشاہ تھا۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کشمیر سے باہر ہندوستان، خراسان، عراق و عرب تک اس کی فیاضی و سیر چشمی اور اس کے اعلیٰ اوصاف کی شہرت تھی (۲۳)۔ سلطان خون خرابے کا قطعاً قائل نہ تھا یہی وجہ ہے کہ اُس نے اپنی زیادہ تر توجہ مُلک کے اندرونی حالات بہتر کرنے پر صرف کی۔ اس کے عہد میں کشمیر ایک مثالی ریاست تھی جس کی بنیادی وجہ سلطان کی علم دوستی اور علم پروری تھی۔

زین العابدین نے تقریباً تمام زبانوں کو کشمیر میں متعارف کرانے کی غرض سے دارلتراجم کا ایک جال بچھایا۔ جس میں ہر زبان کی کتب کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں کشمیر کو علمی ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے ایک اکیڈمی کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جس میں سنسکرت اور عربی کتابوں کے ترجمے فارسی میں کیے جاتے تھے (۲۴)۔ نئے نئے موضوعات پر کتابیں لکھی جاتی تھیں

جن میں بعض کتب کشمیری زبان میں اور بعض فارسی اور سنسکرت زبان میں ہوتی تھیں۔ زین العابدین خود ایک بہت بڑا عالم تھا۔ اُس نے کشمیر میں نہ صرف علم و ادب کو فروغ بخشا بلکہ صنعت و حرفت اور فنون لطیفہ کو بھی کمال عروج پر پہنچایا۔ کشمیر میں کاغذ سازی اور جلد بندی کا فن رائج کیا اور ریشم سازی اور شال بافی جیسی صنعتیں متعارف کروائیں (۲۵)۔ زین العابدین کئی اوصاف کا مالک تھا۔ وہ ایک جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا موسیقار، شاعر اور ادیب بھی تھا۔ وہ موسیقی کا بڑا دلدادہ تھا اور خود ماہر فن بھی تھا۔ اس نے کئی ساز ایجاد کیے (۲۶)۔ ایرانی، تورانی اور ہندی سازندوں اور گویوں کے علاوہ اس نے کئی دوسرے ممالک سے بھی ماہر موسیقار منگوائے۔ المختصر سلطان زین العابدین بلاشبہ اس دور کا ایک ایسا نمائندہ حکمران تھا جس کے اندر دوسروں کے خیالات کا احترام، آزاد خیالی کی حوصلہ افزائی، علم و ادب کی ترقی، تمام مذاہب کا احترام، ہر شخص کے ساتھ ایک جیسا انصاف، ستم رسیدہ لوگوں کی دادرسی جیسی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ اس کے دور میں کشمیر نے ترقی و خوشحالی کا وہ عروج دیکھا جو صدیوں سے ناپید ہو چکا تھا۔ اس کی موت پر یوں نظر آیا جیسے انصاف، سخاوت، علم، عظمت، شان و شوکت، امن و رواداری سب کشمیر سے رُخصت ہو گئے۔ اس کی وفات کے بعد کشمیر کا سیاسی استحکام مشکوک ہو گیا۔ حیدر شاہ سے لے کر حبیب شاہ تک کوئی بھی حکمران ایسا نظر نہیں آیا جو شہاب الدین کی طرح بہادر، سلطان سکندر کی طرح دیندار اور زین العابدین کی طرح علم دوست اور عوام دوست ہوتا۔ اصل میں زین العابدین کے بعد کا دور کشمیر میں شاہ میری خاندان کے انحطاط کا دور تھا۔ جس نے کشمیر میں چکوں کو تخت کشمیر طشتری میں سجا کر پیش کیا۔

اس خاندان کے آٹھ حکمران ۳۱ برس تک مسندِ کشمیر کے مالک و مختار رہے۔ وادی میں چک خاندان کا جدِ امجد لنکر چک راجہ سہدیو کے دور میں دردستان سے آیا تھا اور راجہ کے دربار میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اُس کے بعد شاہ میری عہد میں بھی لنکر چک کی اولاد دربار میں اہم عہدوں پر فائز رہی اور شاہ میری خاندان کے زوال کے دوران ہی چکوں نے کشمیر اور کشمیریوں کو مُغلوں کے سات حملوں سے بچا کر اپنی بہادری اور جراتمندی کا ثبوت دیا۔ چک خاندان شیعہ مذہب کے پیروکار تھے۔ ان کے عہد میں کشمیر کے حالات دگرگوں رہے۔

یہ بڑے شوریدہ سر اور جنگجو تھے جو دردستان (گلگت) سے آ کر کشمیر میں آباد ہوئے تھے۔ چک یقیناً بہترین سپاہی تو تھے ہی مگر مُلک کا انتظام چلانا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ یہی وجہ تھی

غازی چک اور اس کے جانشینوں کی حکومت کا زمانہ آپس ہی کی لڑائیوں میں گزر گیا۔ یعقوب شاہ اس خاندان کا آخری فرمانروا تھا۔ چک عہد میں یقیناً تعمیری کاموں پر بھی زور دیا جاتا رہا اور کافی عوامی فلاح و بہبود کے کام بھی کیے گئے لیکن سب سے بڑی خصوصیت چکوں کے اندر یہ تھی کہ ''کشمیریت'' اُن کی رگوں میں رچی بسی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مغلوں نے کشمیر پر قابض ہونے کے لیے لگاتار سات حملے کیے لیکن ہر حملے میں بہادر چکوں نے اپنے ملک کشمیر کا دفاع کیا۔ محی الدین حاجنی لکھتے ہیں:

یمّیه وقته حضرت ایشان صائب (شیخ یعقوب صرفیؒ) ته دیدی باب صائب (حضرت بابا داؤد خاکیؒ) اکبر پادشهس کشیره پیٹھ حمله کرنه خأطر دِلهِ (دہلی) گیئه، تمه برونهه أسی موغلوپانژه ہن وریَن کشیر زیننه خاطره حمله کری متی۔(۲۷)

ترجمہ: ''جب حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ اور حضرت بابا داؤد خاکیؒ شہنشاہ اکبر کے پاس کشمیر پر حملہ کرنے کی غرض سے دلی گئے، اُس سے پہلے مُغلوں نے کشمیر پر پانچ حملے کئے تھے۔''

چکوں کا اکتیس سالہ دور اگرچہ کشمیر کو تعمیر و ترقی کی منزل پر نہ پہنچا سکا البتہ اُنہوں نے اپنے مُلک کا دفاع بہت اچھے انداز میں کیا۔ غازی چک جو کہ ایک اولوالعزم حکمران تھا۔ اس نے نہایت تدبر و سیاست سے حکومت کی۔ وہ ایک عظیم مُحب وطن کشمیری راہنما تھا۔ وہ ایک ایسا سپہ سالار تھا جس کی رگوں میں کشمیریت رچی بسی تھی (۲۸) وہ ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر بھی تھا۔ اُس نے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد کشمیر کے اُن علاقوں کی تسخیر کا ارادہ کیا جو کہ زین العابدین کے نالائق جانشین گنوا بیٹھے تھے۔ اس عظیم سپہ سالار نے نہ صرف عدل و انصاف کا پرچار کیا بلکہ اپنے ملک کشمیر کی عظمت و رفعت کو بھی چار چاند لگائے۔ جی ایم ڈی صوفی رقمطراز ہیں:

Ghazi Chak was an able, energetic, just but some what stern ruler. He re-conquered Skardu, Gilgit, Kishtwar, Pakhli and Mangli.(29)

غازی چک نے اپنے وطن کا دفاع ناقابل تسخیر بنا دیا تھا۔ اس کے عہد میں بھی مغلوں نے کشمیر کو تسخیر کرنے کے لیے حملے کیے لیکن ناکام و نامراد لوٹے۔ یہ سارا کمال غازی چک کی کشمیر سے والہانہ محبت کا تھا کہ مغلوں کی حسرت دل ہی میں رہ جاتی تھی۔ اِس کی وفات کے بعد غازی چک کا بھائی حسین چک کشمیر کا حکمران بنا۔ یہ طبیعتاً نرم مزاج اور ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ یہ ایک باہمت اور فرض شناس حکمران تھا۔ اس نے اپنی حکومت کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے بہت محنت کی اور عوام کے جان و مال کا تحفظ ہر قیمت پر یقینی بنایا یہی وجہ تھی کہ رعایا اُسے ''نوشیروان عادل'' کے لقب سے یاد کرتی تھی۔ یہ ایک اچھا شاعر بھی تھا اور اہل علم و ادب کا قدردان بھی تھا۔ اس نے اپنے عہد میں تعلیمی ادارہ بھی بنوایا جس سے علم و ادب کو کشمیر میں پھلنے پھولنے کا مزید موقع ملا۔ یوسف ٹینگ لکھتے ہیں:

> حسین شاہ اوس علمہ ادُبك تہ موسیقی ہُنُد شایق۔ پانہ تہِ اوس فارسی زبأنی منُز شأئیری کران۔ فنکارَن تہ اہلِ علمَن اوس قدر تہ پرتھ کَران۔ ائمہ بناؤ پننس و قتس منزہ مدرسہ حسین شاہ تہہ زینہ پورہ دیتُن اکھ مدرسس جاگیرس منزہ یہ مدرسہ چُھ از کل خانقاہ نقشبندی ناوس پیٹھ مشہور تہہ خواجہ بازار سرینگرس منز واقع۔(۳۰)
>
> ترجمہ: ''حسین شاہ علم و ادب اور موسیقی کا دلدادہ تھا خود بھی فارسی زبان میں شاعری کرتا تھا۔ فنکاروں اور اہل علم کی قدر و منزلت کرتا تھا۔ اِس نے اپنے عہد میں مدرسہ حسین شاہ بنوایا اور زینہ پور کو اس مدرسہ کی جاگیر میں دیا۔ یہ مدرسہ آج کل خانقاہ نقشبندی کے نام سے مشہور ہے اور خواجہ بازار سرینگر میں واقع ہے۔''

حسین شاہ کے بعد علی شاہ چک کشمیر کا حکمران بنا۔ یہ بھی طبیعتاً نیک اور عادل انسان تھا۔ اس کے عہد میں بھی مُغلوں نے کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے غلط ارادوں کا اظہار کیا مگر ہمیشہ کی طرح ناکام و نامراد رہے۔ علی شاہ کے نو سالہ عہد میں کوئی خاص تعمیری کام نہ ہوا۔ اس کے بعد

بالترتیب یوسف شاہ، سید مبارک بیہقی، لوہر شاہ چک، یوسف شاہ دوسری مرتبہ اور آخر میں یعقوب چک نے عنان حکومت سنبھالی۔

علی شاہ جو کہ صوفیوں اور درویشوں کا قدردان تھا۔ اس کی وفات کے بعد یوسف شاہ نے کشمیر کی حکومت سنبھالی۔ یوسف شاہ کو دو مرتبہ کشمیر کے تخت کا وارث بننا پڑا۔ پہلی مرتبہ یوسف شاہ تقریباً ایک سال تک حکمران رہا۔ پہلے سال کے دوران یوسف شاہ نے اپنا زیادہ تر وقت اُمور سلطنت سے غافل ہوکر عیش وعشرت اور نغمہ وسرود میں گزارا۔ چونکہ اُسے ایک دہقانی عورت ''حبہ خاتون'' سے عشق ہوگیا تھا، جس سے بعد میں یوسف شاہ نے شادی رچالی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سلطنت کے اُمور سے دُور ہوتا گیا اور بالآخر سلطنت سے ہاتھ دھونے پڑے۔

یوسف شاہ کے پہلے دور میں بے اعتدالیوں نے عروج حاصل کیا اور عوام اس بات سے بدظن ہوگئے۔ امن وامان کی صورتحال خراب ہوگئی۔ جس کے باعث یہ بارگراں سید مبارک بیہقی کے سپرد ہوا۔ جنہوں نے تقریباً چھ ماہ حکومت کی اور پھر ایک سازش کے تحت کشمیر کے تخت کا وارث یوسف شاہ کے عم زاد لوہر چک کو بنا دیا گیا۔ جس نے ایک سال تک کشمیر پر حکومت کی۔ یوسف شاہ جو کہ تخت کشمیر کا حقیقی وارث تھا۔ اُسے جب ہوش آیا تو اُس نے دوبارہ تخت کو حاصل کرنے کی کوششیں جاری کیں۔ اس سلسلہ میں اکبر بادشاہ سے بھی مدد طلب کی اور مغل بادشاہ نے اسے مدد بھی فراہم کی لیکن جلد ہی مغل حکمران اکبر کی مُنافقانہ چال یوسف شاہ کے دماغ میں آ گئی۔ کیونکہ اکبر بادشاہ مدد کی اوٹ میں خود کشمیر پر قابض ہوکر اپنی دیرینہ خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا اور یوسف شاہ ایک بار پھر کشمیر کے تخت وتاج کا وارث بنا۔ اُس نے اپنے وزیر محمد بٹ اور اپنی ملکہ حبہ خاتون کی معیت میں ملک کو اندرونی فتنہ وفساد سے پاک کرکے نظم ونسق کے استحکام کو فروغ بخشا۔ عدل وانصاف اور رعیت پروری کا رویہ اختیار کیا گیا[۳۱] اس طرح ملک کشمیر کے حالات بہتر ہوگئے۔ لیکن یہ سکون کچھ ہی عرصہ تک رہا اور ملک میں شیعہ سُنی فسادات ایک بار پھر بھڑک اُٹھے۔ جنہوں نے ملک کے امن وامان کو تہہ وبالا کردیا۔ ۱۵۸۵ء میں شیعہ سُنی دونوں فرقوں کا شدید فساد ہوا جس میں دونوں فرقوں کا خاصا جانی ومالی نقصان ہوا۔ تو تب اکابرین کشمیر یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اگر یہ فسادات بیرونی امداد سے ختم ہوسکیں تو اس کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اس طرح اکابرین کشمیر کا ایک وفد اکبر کے دربار میں پہنچا اور کشمیر پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ اکبر اعظم نے مرزا قاسم میر بحر کی قیادت میں ایک لشکر کشمیر پر حملے کے لیے روانہ کیا۔ یعقوب شاہ جو کہ

یوسف شاہ کا بیٹا تھا۔ اپنے لشکر کے ساتھ مغل لشکر کے مقابلے کے لیے نکلا۔ محبّ وطن کشمیری بے جگری سے مغلوں کے خلاف صف آرا رہے لیکن اندرونی خلفشار نے چکوں کی قوت کو منتشر کر دیا تھا۔ اس طرح سے یوسف شاہ کی گرفتاری اور یعقوب شاہ کی کشتواڑ کی طرف راہ فرار کیوجہ سے مغلوں نے ۱۵۸۶ء میں کشمیر پر قبضہ کرلیا۔ پی این کے بامزئی لکھتے ہیں:

> Kashmir thenceforth became a province of the Mughal Empire and the Chapter of its long independent status came to close.(32)

مُغلوں کے کشمیر پر قبضہ کے بعد ریاست کا وجود غیروں کے چُنگل میں چلا گیا اور اس طرح سے ایک خودمختار اور آزاد ملک دوسری مرتبہ پابہ زنجیر ہوگیا اور اُس کی آزاد حیثیت ختم کر کے ایک صوبے کی حیثیت دے دی گئی۔ اس طرح سے کشمیری قوم کی آزادی و خودمختاری، عزت و آبرو اور اقتدار اعلیٰ کے یہ آخری نشانات مٹ گئے اور کشمیر ہمیشہ کے لیے غلامی کے قعر مذلت میں ڈوب گیا۔

کشمیر کی خوبصورتی اور قدرتی حسن پر بیرونی حکمران ہمیشہ جان نچھاور کرتے رہے اور اس جنت نظیر کو تسخیر کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ لیکن کشمیر کے مسلم اور غیر مسلم محبّ وطن حکمرانوں نے ہمیشہ ہی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر اپنے وطن کا بھرپور دفاع کیا۔ مغلوں کا یہ دیرینہ خواب تھا کہ یہ جنت نظیر تسخیر ہوکر کب ہمارے قبضے میں آئے گی۔ اس کے لیے انہوں نے کشمیر پر متعدد حملے کیے اور بالآخر ۱۵۸۶ء میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔

۱۵۸۶ء میں اکبر نے کشمیر کے مقامی اکابرین کی مدد و اعانت سے کشمیر کو تسخیر کر کے اپنی سلطنت کا ۱۷واں صوبہ قرار دیا۔ کشمیر آزاد ملک کی حیثیت سے اپنی شناخت کھو گیا۔ اگرچہ کشمیر غلام بن گیا لیکن مغلوں نے زراعت، صنعت وحرفت اور تعلیمی میدان میں جنت نظیر کو چار چاند لگائے۔ مغل عہد میں زراعت اور صنعت وحرفت نے خوب فروغ پایا۔ اکبر بادشاہ کے عہد کے دوران سرینگر سے گجرات تک سڑک تعمیر کی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ حسن ابدال، مظفر آباد اور بارہ مولہ کی شاہراہوں کو بھی بہتر بنایا گیا۔ مغلوں کو کشمیر کے قدرتی حسن اور خوبصورتی سے شدید لگاؤ تھا۔ انہوں نے کشمیر میں کئی خوبصورت عمارتیں اور باغات لگوائے۔ مغلوں کے آثار و نقوش قلعہ ہری پربت، نسیم باغ، شالا مار باغ، نشاط باغ، چشمہ شاہی، چشمہ ویری ناگ، اچابل، پتھر مسجد، پری محل اور بھمبر کی تاریخی عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ چنار کے بلند و بالا درخت جو کشمیر میں ہر جگہ نظر آتے ہیں انہی کی یادگار ہیں (۳۳)۔ انہوں نے وادی میں علم و ادب اور فنون لطیفہ کو بھی فروغ دیا

جس کی وجہ سے وادی سیاحوں تاجروں، علماء اور شعراء کی آمد و رفت اور سکونت سے ترقی و خوشحالی کا گہوارہ بن گئی۔

مغل عہد میں فارسی علم و ادب نے خاصی ترقی حاصل کی اور بڑی تیزی سے فارسی نظم و نثر لکھنے کا رواج پیدا ہوا۔ ملا طاہر غنی کشمیری جیسے یگانہ روزگار شاعر کا تعلق بھی اسی عہد سے تھا۔ اسی عہد میں ملا محسن فانی کی کتاب ''دبستان مذاہب'' لکھی گئی (۳۴)۔ مغل عہد ہی میں شیخ جمال الدین، بابا اسماعیل کبروی، ملا یونس راشدی جیسی عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں جنہوں نے علم و ادب اور شعر و سخن کے میدان میں عروج حاصل کیا۔ مغلوں نے کشمیر میں علم و ادب کو پھیلانے کے لیے مدارس کے جال بچھائے۔ ان مدارس کو حکومتی سرپرستی حاصل ہوتی تھی اور وہاں بڑے بڑے جید علماء علم کو پھیلانے میں ہمہ وقت مصروف عمل رہتے تھے۔ ڈاکٹر یوسف بخاری لکھتے ہیں:

> مُغل بادشاہن ہیندس وقتس منز بناوٗ مُلا حیدرن درسگاہ ملا حیدر یُس جہانگیر سندیس وقتس منزہ گوجوٗرس منزہ اُسہ۔ شاہجہانستندیس وقتس منزہ تراوٗ خواجہ اخوند محمود نقشبندی صائبن مدرسہ خواجگان نقشبندی بیچ بنیاد۔ شہزادہ داراشکوہ تراوٗاکہ مدرسچ بُنیاد یتھ ''کسب ماہ'' ناوٗ اوس تہہ اتھ منزاوس صرف تصوف ایوان پرناوہنہ۔ ایمہ علاوہ تراوٗ اکہہ مشہور مدرسچ بنیاد تہہ اتھ اوس ناوٗ ''مدرسہ سید منصور'' ائمک سرپرست آسہ تمہ وقتھ گورنر نواب عنایت اللہ خان۔''(۳۵)

ترجمہ: ''مُغل بادشاہوں کے عہد میں مُلا حیدر نے ''درس گاہ ملا حیدر'' بنائی جو جہانگیر کے عہد میں گوجوارہ میں تھی۔ شاہجہان کے عہد میں اخوند محمود نقشبندی صاحب نے مدرسہ خواجگان نقشبندی کی بنیاد رکھی۔ شہزادہ دارہ شکوہ نے ''کسب ماہ'' نام کے ایک مدرسے کی بنیاد رکھی اُس میں صرف تصوف پڑھایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مشہور مدرسے کی بنیاد ڈالی گئی جس کا نام مدرسہ سید منصور تھا اور اُس وقت کے گورنر نواب عنایت اللہ خان اُس ادارے کے سرپرست تھے۔''

مغلوں نے کشمیر پر تقریباً ۱۶۶ برس حکومت کی۔ اپنے عہد حکومت میں مغلوں نے تعمیرات کی

طرف بھی خاص توجہ دی۔ انہوں نے سڑکوں کے جال بچھائے۔ سرائیں تعمیر کروائیں، زمین کی پیمائش کو از سر نو مکمل کروایا گیا۔ اس سلسلہ میں اکبر بادشاہ نے ٹوڈرمل (وزیرخزانہ) کی نگرانی میں زمین کی از سرنو پیمائش کروائی اور لگان کی تشخیص کی گئی (۳۶)۔ سب سے بڑھ کر مغلوں کے عہد میں کشمیر کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، جس کا سبب وہاں کے سیاحتی مقامات تھے جنہیں مُغلوں نے سیاحوں کی دلچسپی کے لیے تعمیر کیا تھا۔ مُغل سلطنت کے خاتمے کے بعد کشمیریوں کو ایک بڑا نقصان جو اُٹھانا پڑا وہ یہ کہ اُن کی آمدنی کے ذرائع کم ہوگئے تھے۔ اس عہد میں کشمیر کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ انسائیکلو پیڈیا آف کشمیر کیمطابق:

> "During Mughal era, Kashmir yielded a revenue of about one crore. They also abolished many taxes on saffron, tax on wood and poll-tax on sheep and boatmen.(37)

مغلوں نے نہ صرف علم و ادب بلکہ صنعت و حرفت اور فنون لطیفہ کی طرف بھی خصوصی توجہ دی۔ یہی وجہ تھی کہ کشمیر کے فنون لطیفہ کی انہوں نے نہ صرف حفاظت کی بلکہ اُس کو مزید فروغ دینے کے لیے کوششیں بھی کیں۔ پروفیسر محی الدین حاجنی لکھتے ہیں:

> ''موغلوائی پنہ وقتہ وار یاہ ووستہ کارشالباف اندجانہ پیٹھ تہ کرِکھ کشیر مَنز آباد۔ شالَن کونَن پیٹھ یم گُل آ زکھار نہ چھ یوان، تمن مُتلِق چُھ یوان وننہ زِ یہ چیز چُھ اندجانٔی کأری گرَن ہنٛد دیُت۔ جگہ طرز کی شأل اُسی موغل دورَس منٛز سیٹھاہ مقبول۔ (۳۸)
>
> ترجمہ: ''مغلوں نے اپنے عہد میں اندجان سے شالباف کشمیر میں لاکر آباد کیے۔ شالوں کے کونوں پر جو پھولوں کی کڑھائی ہوتی ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اندجان کے کاریگروں کی مرہون منت ہے۔ اس طرح کی شالیں مغل دور میں بہت زیادہ مشہور تھیں۔''

مغل حکمرانوں نے یقیناً کشمیر کو ہر میدان میں ترقی کی راہ پر گامزن کیا لیکن دوسری طرف انہیں بزدل، سست اور کاہل بنانے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انہوں نے کشمیر کو اپنے زیر تسلط

کرنے کے بعد اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے خوب کوششیں کیں۔ انہوں نے کشمیر پر قبضہ کرنے کے بعد اسلحہ سازی پر مکمل پابندی لگادی۔ فوج میں کشمیریوں کے داخلے کو ممنوع قرار دیا گیا اور کشمیریوں کو سست اور ناکارہ بنانے کے لیے پھیرن اور کانگڑی کو رواج دیا(۳۹) یہ سلسلہ بعد میں آنے والے حکمرانوں کے ادوار میں بھی چلتا رہا۔

مُغل حکمران خود کشمیر کی نگرانی نہیں کرتے تھے بلکہ صوبہ ہونے کی حیثیت سے اپنے صوبیداروں کے رحم و کرم پر انہوں نے وادی اور وہاں کے لوگوں کو چھوڑا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وادی میں مختلف صوبہ داروں کے عہد میں اتار چڑھاؤ پیدا ہوتے رہے اور بالآخر اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت بتدریج زوال پذیر ہوتی گئی اور کشمیر بھی تفرقہ بازی اور خانہ جنگی کی لعنت میں گرفتار ہوگیا۔

اس تفرقہ بازی اور خانہ جنگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میر مقیم نامی ایک سردار نے کابل پہنچ کر احمد شاہ ابدالی کو کشمیر پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی جبکہ نادر شاہ درانی کے حملوں نے مغلوں کی مرکزی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس بہادر جرنیل کے قتل کے بعد اس کا مصاحب خاص احمد شاہ ابدالی روبہ سلطنت ہوا۔ اس نے بڑی حکمت عملی کے ساتھ ۱۷۵۲ء میں مغلوں کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد مغلوں کا عروج زوال پذیر ہوتا گیا۔ مُغلیہ سلطنت کے آخری زوال پذیر اور پُرآشوب دور میں کشمیری قوم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ بالآخر مغل حکمرانوں کے زوال کے بعد کشمیر کی حکومت افغانوں کے حصہ میں آ گئی۔ ۱۷۵۳ء میں کشمیر افغانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ انہوں نے کشمیر پر ۶۷ برس حکومت کی۔ ان ۶۷ برسوں میں افغان بادشاہوں کی طرف سے ۲۴ صوبے دار یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے۔ ان گورنروں میں سے صرف چند ایک نے ظلم و تشدد اور استحصال کی کارروائیاں جاری رکھیں (۴۰)۔

افغان دور میں کشمیر کے لوگوں پر سخت آفتیں آئیں۔ ان برسوں کے دوران کچھ گورنر تو آفت کے پرکالا تھے۔ ان کے عہد میں ہندو دولت مند ہونے کی وجہ سے زیادہ لُٹے چونکہ مسلمانوں کے پاس رشوت دینے کی استطاعت نہیں تھی اس لیے وہ زیادہ مارے جاتے یا پھر بیگار میں پکڑ لیے جاتے۔ کشمیر پر ان کی حکومت کا زمانہ بڑی بدامنی اور ہل چل کا زمانہ تھا دراصل انہیں اس سے پہلے اتنی بڑی سلطنت پر حکومت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اسی لیے وہ نہ تو سلطنت کے آداب سے واقف تھے اور نہ ہی قانون اور آئین سے باخبر تھے۔ کیونکہ ان کی کائنات چند پرانے اصول تھے جو

اُن کے اپنے قبیلوں میں صدیوں سے چلے آ رہے تھے لیکن یہ اصول ایک قبیلے کے لوگوں کو متحد رکھنے کے لیے موزوں تو ہو سکتے تھے مگر ایک بڑی سلطنت اور فرمانروائی کے لیے موزوں نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ حکمران کشمیریوں کے دل و دماغ کو فتح نہ کر سکے۔ اس تاریک عہد کے ایک ظالم گورنر بلند خان کی نظامت میں کشمیر فسادات کی نذر ہو گیا(۴۱) شیعہ سنی فسادات عروج پر پہنچ گئے اور اہل تشیع کی ایک بستی ''زڈی بل'' آگ کی نذر ہو گئی۔ یہ ان حکمرانوں کی نالائقی تھی کہ وہ ایک ہی علاقے کے لوگوں کو پر امن نہ رکھ سکے۔

افغانوں کے عہد میں کشمیر کے لوگوں پر جہاں آفتیں نازل ہوئیں وہاں پر کشمیریوں کو معاشی طور پر بھی مفلوج کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی عصمتوں اور رفعتوں کو بھی تار تار کیا گیا۔ اس کربناک عہد میں کشمیر سے خوبصورت لڑکیاں جبراً اغوا کی جاتیں اور انہیں کابل کے بازاروں میں سرعام فروخت کیا جاتا اور کشمیر کے تنومند لوگوں کو کابل میں لیجا کر ان سے باربرداری کا کام لیا جاتا تھا۔ کریم داد خان پہلا حکمران تھا جس نے کشمیر کی ساری پیداوار کابل برآمد کرنے کا قانون بنایا(۴۲) وہ کشمیر کی عمدہ پیداوار چاول، زعفران اور پھل وغیرہ کابل بھیجتا جبکہ وہاں سے کشمیریوں کے لیے مکئی، چنا اور باجرہ برآمد کرتا۔ اس صورتحال کے پیش نظر کشمیر کے زمینداروں نے پھلوں کے باغات کاٹ دیئے اور چاول کی کاشت کرنا بند کر دی۔ جس سے کشمیر کی معیشت کو ایک بڑا دھچکا لگا۔ اس کے علاوہ زندگی کے تمام شعبوں پر ٹیکس عائد کر رکھے تھے۔ اس طرح سے کشمیریوں کو جلد ہی احساس ہو گیا تھا کہ ہم سانپ کے منہ سے نکل کر اژدھے کے منہ میں چلے گئے ہیں۔

مغلوں کی طرح چند ایک افغان گورنروں نے بھی اپنی عیاشی کے لیے فن تعمیر کی طرف توجہ دی۔ جس میں باغات، جزیرے، قلعے اور پل قابل ذکر ہیں۔ امیر خان ایک عیاش افغان گورنر تھا۔ جس نے اپنی عیاشی کے لیے جھیل ڈل میں ''سونہ لانک'' کے نام سے ایک مصنوعی جزیرہ تعمیر کروایا(۴۳) اس نے جزیرہ پر سات منزلہ محل تعمیر کروایا۔ اس کے علاوہ امیر آباد کے نام سے ایک باغ بنوایا۔ اس کے ساتھ ساتھ سرینگر میں شیر گڑھی کے نام سے ایک قلعہ تعمیر کروایا اور دریائے جہلم پر امیر کدل کے نام سے ایک پل بنوایا۔ امیر خان نے ایک منفی کام جو اس ضمن میں کیا وہ مغلوں کی تعمیر کردہ پرانی عمارتوں کو خاصا نقصان پہنچایا جس کی وجہ سے فن تعمیر کے میدان میں بھی کشمیر کو خاصا دھچکا لگا۔

کشمیر میں افغانوں کی عملداری ۱۸۱۹ء تک قائم رہی۔ کابل کی طرف سے جتنے بھی

صوبیداروں کو یہاں بھیجا گیا ان میں اکثر اکھڑ، ظالم اور حریص تھے۔ اس عہد میں کشمیری بلاتفریق مذہب و ملت بڑی بے دردی سے لٹے۔ لیکن افغان صوبیدار مذہبی معاملات میں بڑے روادار تھے۔ اگرچہ وہ پُرسکون حالات نہ ہونے کے سبب اشاعت اسلام کی طرف خاص توجہ نہ دے سکے۔ لیکن اس کے باوجود افغان دور کی اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے کیونکہ اسی عہد کے ایک گورنر عطا محمد خان نے شیخ نورالدینؒ رشی کے احترام میں ان کے نام سے کشمیر میں سکہ جاری کیا(۴۴)۔ یہ غالباً دنیا کی تاریخ میں واحد مثال ہے کہ کسی حکمران نے کسی صوفی بزرگ کے نام سے سکہ جاری کیا ہو۔ اس کے علاوہ افغانوں نے سابقہ مسلمان حکمرانوں کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے غیر مسلموں کو بھی کلیدی عہدوں پر تعینات کیا جن میں دلا رام قلی، سکھ جیون مل، کیلاش در اور گورمکھ داس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انگریزوں اور سکھوں کی تیار کردہ سازش کی وجہ سے ۱۸۱۹ء میں کشمیر پر سے مسلمانوں کی تقریباً ساڑھے چار سو سالہ حکومت کا خاتمہ ہوا کیونکہ انگریزوں ہی کے ایماء پر رنجیت سنگھ نے کشمیر پر ۱۸۱۳ء-۱۸۱۴ء اور ۱۸۱۹ء میں حملے کیے اور آخری حملے میں کامیابی پر مسلم حکومت کا خاتمہ ہوا اور ایک مرتبہ پھر کشمیر غیر مسلموں کے تسلط میں آ گیا۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

(1) Al-Biruni, Kitab al-Hind, (English translation By E.C. Sachau), vol. I, p.206.

(۲) وانی، محمد اشرف، کشمیر میں اسلام، اوری اینٹل ہاؤس سرینگر، ۵۰۰۴، صفحہ ۵۰

(۳) محبّ الحسن، کشمیر سلاطین کے عہد میں، ندیم یونس پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۴، ص ۴۰۔

(۴) تسکین، غلام حسن، وولرک مُلر، شالیمار آرٹ پریس سرینگر، ۱۹۸۲ء، ص ۹۷۔

(۵) ایضاً، ص ۸۰، ۸۱۔

(6) Sufi, G.M.D., Kashir, vol-I, University of the Punjab, Lahore, 1948, p.81.

(۷) تشنہ، نذیر احمد، پروفیسر، مطالعہ کشمیر، مقبول اکیڈمی شاہراہ قائداعظم، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۷۔

(۸) صدیقی، محمد عبداللہ، تاریخ کشمیر، ایور نیو بک پیلس لاہور، س ن، ص ۳۳۔

(۹) عبدالخالق خان، کشمیر میں صوفیائے کرام کی دینی خدمات (مقالہ پی ایچ ڈی)، شعبہ علومِ اسلامیہ، جامعہ کراچی، ص ۵۵۶۔

(۱۰) محمد شریف طارق، چوہدری، جموں و کشمیر کے سینے پر خونی لکیر، ایس ٹی پرنٹرز گوالمنڈی، راولپنڈی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۴۔

(۱۱) حاجنی، محی الدین، مقالات، نور محمدی پریس، سرینگر، ۱۹۶۷ء، ص ۱۱۔

(۱۲) گہنار، جے، این، کشیر منز بُدھ مت، کاشر ڈپارٹمینٹ، کشمیر یونیورسٹی سرینگر، ۱۹۸۳، ص ۱۴۷۔

(۱۳) میر، جی، ایم، کشور کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ، رضوان پبلشرز میر پور، ۲۰۰۴، ص ۱۱۸۔

(۱۴) عبدالغنی اصغر، ملک، ڈاکٹر، کشمیر کا عروج و زوال، ہمالیہ پبلشرز انٹرنیشنل کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۸۔

(15) Sufi, G.M.D., Kashir, vol-I, p.136.

(۱۶) خستہ، ہرگوپال کول، گلدستہ کشمیر، آریہ پریس لاہور، ۱۸۸۳ء، ص۱۰۴

(۱۷) کلیات اقبال (فارسی) مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۳ء، ص۵۰۷۔

(۱۸) ایم ایس ناز، ڈاکٹر، کشمیر عہد بہ عہد، مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ چوک انارکلی لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۱۴۶۔

(19) Muhib-ul-Hasan, Professor, Kashmir under the Sultans, National Book Foundation, Islamabad, 1990, p.53.

(۲۰) فرشتہ، محمد قاسم، گلشن ابراہیمی المعروف تاریخ فرشتہ جلد نمبر۰۲، نولکشور لکھنؤ، ۱۹۷۴ء، ص۳۴۱۔

(۲۱) محمد اعظم دیدہ مری، خواجہ، واقعات کشمیر، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۸۹۔

(۲۲) خستہ، ہرگوپال کول، گلدستہ کشمیر، جلد نمبر۰۲، آریہ پریس لاہور، ۱۸۸۳ء، ص۱۱۰۔

(۲۳) فوق، محمد دین، شباب کشمیر، ویری ناگ پبلشرز میرپور آزاد کشمیر، ۱۹۸۷ء، ص۲۲۶۔

(۲۴) سالک، علم الدین، کشمیر مسلمانوں کے عہد میں، ماہنامہ ادبی دنیا ''کشمیر نمبر، مطبوعہ آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۶ء۔

(۲۵) یوسفی، اللہ بخش، مختصر تاریخ کشمیر، محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی کراچی، ۱۹۶۰ء، ص۲۸۔

(۲۶) سالک، علم الدین، نقوش کشمیر، مقبول اکیڈمی شاہراہ قائداعظم لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۴۹۔

(۲۷) حاجنی، محی الدین، مقالات، ص۱۱۱۔

(۲۸) چاہ ڈورا، حیدر ملک، تاریخ کشمیر، لاہور، ۱۹۱۷ء، ص۲۰۱۔

(29) Sufi, GMD, Kasheer, vol-I, p.219.

(۳۰) ٹینگ، یوسف، کشیر (سون ادب) جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر، ۱۹۷۸ء، ص۵۳۔

(۳۱) میر، جی ایم، کشور کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ، ص۱۴۲۔

(32) Bamzai, P.N.K., Cultural and Political History of Kashmir, Metropolitan Book Company, Delhi, 1962, p.150.

(۳۳) مینن، وی پی، رائے بہادر، کشمیر اور جوناگڑھ کی کہانی، کتاب منزل، کشمیری بازار لاہور، ۱۹۴۰ء، ص۲۰۴۔

(۳۴) عباسی، محمد سرور، پروفیسر، کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی، انسٹیٹیوٹ آف کشمیر سٹڈیز، آزاد جموں وکشمیر یونیورسٹی مظفر آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۔

(۳۵) بخاری، محمد یوسف، ڈاکٹر، کاشر کتھا و کشمیری لسانیات، محمد عُمر بٹ اینڈ برادرز، لاہور، س ن، ص ۱۷۔

(۳۶) حسرت، چراغ حسن، کشمیر، نیشنل بُک فاونڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۳، ص ۸۵۔

(37) Encyclopaedia of Kashmir, vol-I, Anmol Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1985, p.358.

(۳۸) حاجنی، محی الدین، پروفیسر، وولرک مُلر، شالیمار آرٹ پریس سرینگر، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۱۔

(۳۹) عبدالغنی اصغر، ملک، ڈاکٹر، کشمیر کا عروج و زوال، ہمالیہ پبلشرز انٹرنیشنل کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۵۸۔

(۴۰) فوق، محمد دین، مکمل تاریخ کشمیر، ظفر برادرس تاجران کتب، ظفر منزل لاہور، ۱۹۳۶ء، ص ۶۳۹۔

(۴۱) ایضاً۔

(۴۲) آزاد، محمود، سید، تاریخ کشمیر، ادارہ معارف کشمیر، باغ آزاد کشمیر، ۱۹۷۰ء، ص ۴۸۷۔

(۴۳) میر، جی، ایم، کشور کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ، رضوان پبلشرز میر پور آزاد کشمیر، ۲۰۰۴ء، ص ۱۸۶۔

(۴۴) گمی، سلیم خان، کشمیر میں اشاعت اسلام، یونیورسل بُکس، اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۴۔

Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 31, Sr.No.79, 2010, pp 03 – 12

مجلہ تحقیق
کلیہ علوم شرقیہ
جلد31 اپریل ــ جون 2010، شمارہ 79

Intertext and Allusion in the Yunus' Story as Presented by the Holy Qur'ān

* Muhammad Abid Nadeem
**Prof. Dr.Hafiz Mahmood Akhtar

Abstract:

Together with several other facets, there subsist chronicles of the Prophets of yore in the holy Qur'an. These anecdotes are not in a linear manner, at one place giving all the details. This technique has created an anxiety in the minds of many people that perhaps the Qur'anic text is not coherent. Intertext in the Qur'anic text has been a matter of great debate since the very beginning. Too many Islamic scholars have paid heed to this issue. The stories of the Prophets are scattered in various chapters giving different features. Yunus, the Prophet of Allah has been accounted in different chapters explicating different aspects of his life but it does not mean that if the story of Prophet occurs in different chapters it carries a new message but it is an amplification on earlier digest. This devised contrivance is used in reply to the milieu or to be consistent with the particular Surah's intent. This essay is an embellishment of this Qur'anic premise.

Introduction:-

There exists repetition, similarities and variation in the Qur'anic presentation of Yunus' story. What's the wisdom behind this? There exists three fundamental aspects:

1. Linguistic variations
2. Moral emphasis that determine a particular linguistic style and contextualize the story within a particular surah
3. The extent to which the style serves that surah's objectives

* Ph.D. Scholar, Department of Islamic Studies, University of the Punjab, Lhr.
** Co-Author: Dean, Faculty of Islamic Studies, University of the PunjabLhr.

Due to this specialty of the Qur'ān, there is an anxiety and frustration among the orientalists, especially about those Qur'ānic narratives where accounts tend to split in to separate incidents instead of linear sequence. Due to this, they characterize the Qur'ānic style as disjointed. G. Margoliouth calls the Qur'ānic style strange, unbalance and fantastic.(1) A. J. Arberry mentions that the Qur'anic style is not rationally coherent.(2) Nicholson opines that the style is having preposterous arrangement, obscure, tiresome, uninteresting, farrage of long winded narratives and prosaic exhortation.(3) In the introduction of E.H. Palmer's Qur'ānic translation R.A. Nicholson has called this abruptness and incoherence its beauty depicting that it is a divine book, not a dissertation like monographs of other people.(4) George Sale views that there exist unnecessary repetitions in the Qur'ān which appear to ridiculous in a translation.(5) Charles J. Adams recounts that its style disregards chronology, systematic fashion and logical structure.(6) Guillaum asserts the style as arbitrary and haphazard.(7) Daniel proclaims, the style is disorderly in the eyes of several authors.(8) Bell states, the style is a multitude of disconnected piece that cannot be explained linguistically.(9)

Contrary to orientalists' view point Muslim scholars affirm that the style is coherent. So many Muslim scholars have paid heed to this aspect of the Qur'ān. Burhān al-Din Abi al-Hasan Ibrāhim ibn `Umer al-Biqa'i has tried to highlight this contextual factor.(10) Sheikh `Abdul-Qāhir Jurjāni deems coherence, a beauty of the holy Qur'an.(11) Allāma Suyuti also accepts coherence in the Qur'ānic text.(12) Imam Razi has based his exegeses on the coherence of the holy Qur'ān and Qādi 'abu 'al-Sa`ud also xplicate such an attribute. (13) `Ubaid ullāh Fahd al-Falāhi calls the Qur'ānic style as linear, jointed like the beads in a string. The coherence is present from start to end. It is quite evident at some place but hidden at the others.(14) Hamid al-Din Farāhi also sorts coherence in the Qur'anic verses.(15) Mufti Ahmed Yar Khan Na`imi elaborates connection between Qur'anic verses in his exegeses.(16) Amin Ahsan Islahi assumes it necessary to know the coherence of different verses in a context.(17) Taqi `Usmani imagines it the base of difference between chronological arrangement and compilation arrangement of the Qur'ān.(18)

A great contradiction between orientalists' view point and the Muslims is there. Actually the point is, at each occasion, the difference is due to that surah in which each episode appears. The themes, objectives and contexts of each surah shape the rendering of the story therein. It is a manifestation of Qur'ānic unity. Yunus' story has been explicated in four chapters(Surahs) in the holy Qur'ān and a chapter has been given the name Yunus. This reminds the transcendental status of the Prophets, their obligations and the torment imposed upon non-believers and reward of believers. Yunus(A.S) seems so frustrated with his people that he leaves them and during his journey he is engulfed by the whale.

Surah Yunus urges man that the creation does not have materialistic facet only. The most wonderful is the revelation of God through Prophets and Scriptures; how men deny it and how they are punished by Him. Here the anecdote serves the purpose of this Surah.

"Why was there not a single township(amon those We warned), which believed- so its faith should have profited it-except the People of Jonah? When they believed, We removed from them the penalty of Ignominy, in the life of the present, and permitted them to enjoy(their life) for a while."(10:98)

In Surah al-Anbiyā', it has been emphasized that God pays heed to the cries of His faithful servants, the rescue of such faithful during turmoil is a manifestation of the Mercifulness of al-mighty Allah. Therefore, in it the story manifests God's special Mercifulness to his messengers. It is God's attribute manifested with the names of al-Rehman and al-Rahmah.(19)

"*And remember Dhu al Nūn, when he departed in wrath: He imagined that We had no power over him! But he cried through the depths of darkness, "There is no god but Thou: glory to Thee: I was indeed wrong!" So We listened to him: and delivered him from distress; and thus do We deliver those who have faith.*"(21:87-88)

Surah al-Sāfāt shares some contextual similarities with Suah al-Anbiyā'. It is manifestation of God's spiritual mysteries, both in the apparent world and in the heavens. It has been urged to prove the defeat and expiration of the evil. It has been explicated with reference to the angels and the stories of the earlier Prophets, from Noah(A.S) to Yunus(A.S), the story of Yunus(A.S) is the last of all in this Surah.

"So also was Jonah among those sent(by us). When he ran away(Like a slave from captivity) to the ship(fully) laden. He (agreed to) cast lots, and he was condemned: The the big Fish did swallow him, and he had done acts worthy of blame. Had it not been that he (repented and) glorified Allah, he would certainly have remained inside the Fish till the Day of Resurrection. But We cast him forth on the naked shore in a state of sickness. And We caused to grow, over him, a spreading plant of the Gourd kind. And We sent him (On a mission) to a hundered thousand (Men) or more. And they believed; so We permitted them to enjoy (their life) for a while."(37:139-47)

Surah al-Qalam, defines the reality as compared to the false standards set up by man. So, in this Surah, the episode is framed to negate such false attributes adopted by man.

"So wait with patience for the command of thy Lord, and be not like the companion of the Fish-when he cried out in agony. Had he not Grace from His Lord reached him, he would indeed have been cast off on the naked shore, in disgrace. Thus did his Lord choose him and make him of the company of the righteous."(68:48-50)

Yunus' call and the response of his people

Yunus(A.S) as a Prophet has been referred to in Surah al-Safat. Tabri and Ibn Kathīr have illuminated that he was a Prophet to the people of Nineveh.(20) His people were more than one lac.(37:147) He was stoned and expelled from his city two times but the Apostles of Bani Israel returned him back.(21) Third time they again did not take any notice, he left them. Though, directly it has not been elucidated what response did his nation paid to him but is given that when his people did not pay heed to his warning, he denounced Allah's wrath on them and left. His flee from his people and gobble up by the whale is accounted. It also portrays the image of God's mercy for His beloved ones. He is always gracious to His docile. On rebuff, though His wrath is aroused but when His acquiescent beseeches, He showers His mercy upon that. This is quite in accordance with main thesis of the surah in which other Prophets have also been mentioned as slaves of God whose are always paid heed by almighty Allah and his incantation is also regarded. Yunus' story is outlined in such a way that is in accordance to this surah's most important premise; the promised victory and support that God gives His messengers, as indicated in 37:171-182, where Prophet

Muhammad(SAW) is being consoled when the Meccans rejected and teased him and also urged to adhere to the ordains commanded. Rightly has been observed by Baghvī:

He was rescued from anguish as he was grateful, devotee and appreciative to God.(22)

Amin Ahsan Islahi has related this plot an extension of surah's theme by saying:

It is a continuity of previous theme being discussed and Muhammad(SAW) is being persuaded, not to overlook the duty, as was done by Yunus(A.S)(23)

Maulana Maududi has underscored that this distress was caused as he disregarded his duty and it is being verified that it is not a discomfited matter, the Prophet's suffering and Prophet is always desirous for God's help.(24)

Syed Qutb has elucidated that wisdom behind this allegory is; the ease provided to believers while previous anecdotes reveal the end of unbelievers. So, 'O Muhammadans' you may choose the abode whatever you like from these two.(25)

In Surah Yunus, rather than accounting Yunus, anecdote of his nation has been referred to. Here countancy of sin has been elaborated as a warning. It has been alluded that exception lies only in case of Yunus' people. When the Nineveh city was near to destruction due to the defiance of its residents, it was saved because of their repentance. As Surah's notion is to grasp man, the presence and omnipotence of Allah through various objects of nature. All worldly luxuries are to benefit man but they are the signs of almighty Allah. Man has to lower his wings of humility before him and if he goes up against His commandments, nothing of this world would rescue him from His wrath. It is only God's benevolence that recoups man from His resentment.(26) All these things are just evidences of His presence, oneness and all powerfulness. It confirms his traits of suppression, authority and all-inclusive control over the world. Believers will be awarded His pleasure in this world and the world hereafter. Atheists will not escape from the punishment. In this context Yunus' story also exhibits the same scene. (10:98) al-Biqā`ī has explicated it as the prolongation of the running theme that staging of evidences by the Apostle, an utmost aspiration for them to embrace Islam and their continous denial should not worry him as their

guidance to right path is in His hands and all these account refer to that.(27)

Yunus' story as quoted in Surah al-'Anbiyā', is his exodus from the city.(21:87) After his exile from the city he was engulfed by the whale and in this surah Prophet Muhammad(SAW) is being invited to remember Yunus(A.S), when he cried through the depths of darkness; God delivered him from distress. This is also quite in harmony to the theme of Surah. In this surah mercifulness of God has been echoed especially with references to such servants as Noah, Job, Idrīs and Zakariya(A.S), when they asked for God's help, they were granted. This episode serves primarily to show God's Mercifulness to His messengers, a thesis reaffirmed several times. In this way Prophet Muhammad(SAW) is consoled relating the stories of other Prophets against the rising enmity of Meccans.(21:51-93)

'Ālūsī has observed that Yunus(A.S) assumed to be helpless against the insolence of his people, it was a satanic temptation. So, he secluded himself from his nation instead of waiting for God's commandments.(28)

In Surah al-Qalam theme described by Yunus' story is that God's wrath is aroused if the assigned duty is neglected, rejected or abandoned. After the execution of torment it is God's clemency that He grants favour to his servants. Rightly has been accounted by Tha`ālabī:

In the previous verses admonition is being recounted and in this connection, as suffering and hardship is expected in the way of preaching, it being warned; not to be like showing the impatience.(29)

"Here is a double allegory of Allah's mercy and forgivefulness, and a command to patience, and complete and joyful submission to the will of Allah."(30)

Conclusion

The arguments presented above reveal that if the story of Prophet occurs in different chapters it nevertheless carries a new message but it is an elaboration on earlier digest. This devised contrivance is used in reply to the milieu or to be consistent with the particular Surah's intent. For example Surah al-Qalam opens with the hard words against the hypocrites and the Holy Prophet(SAW) is being asked not to follow their footsteps. This issue prevails

throughout this Surah. Times and again giving reference to rebellious people, holy Prophet(SAW) and his followers are being exhorted to proscribe such an enterprise that may arouse His wrath, an example of this, Yunus is.(68:9-12) It also negates the false perception to assume wealth and progeny as cause of deference and triumph.

In Surah al-Safat, Surah starts with the very theme of monotheism. It is He, one and only Lord, Creator of everything, its sustainer, averts torment from his earnest compliants, among them, Yunus is one. The account of other Prophets like Noah, Ibrahim, Ismail and Ilyas (A.S) also strengthens the theme of this Surah.

In Surah Yunus, Surah's start is with the indications of God's presence and His all powerfulness.(10:1-70) It is withins the reach of Him that He takes notice of penitence of the people. Yunus' people have been enlisted among those who were under His rage but rescued as a result of their supplication.

In Surah al-Anbiyā', the very first memorandum is the affliction of the Day of Judgement. Reader has been continously tempted to adhere to such pursuit as may initiate God's bliss, as Yunus invoked His Lord and He listened his cry from the darkness.

Yunus' tale has been discussed in various chapters, in diverse style but despite of its recurrence and distinction, it markedly asserts the following vital arguments:

a. As on the whole message of the Qur'ān is to call the people to divine revelation. It has been framed like this that it is not a new dogma, but it is extension of the message as is being bestowed through the agency of Apostles, of them last is Muhammad(SAW). Thus his message is like the commentary on the previous messengers, which conversed the same. Thus the denial of any one will stand as the denial of all the Prophets.
b. Analogy can be traced among Yunus(A.S) and Muhammad(SAW) as he was teased by his people like Yunus(A.S), stoned and forced to migrate from his native city like him but all the actions of Muhammad(SAW) are under God's guidance, he never tried to escape from the situation, rather faced it till he was commanded by almighty Allah to migrate.

c. The story has been narrated at four different places, it serves the purpose to bolster the belief of the pious people by portraying that a time will come when they will be given relief. It also illustrates the restatement of God's message and someone's constant struggle to resubmit to fidelity when he is relentlessly lured away.
d. Conveying God's message consists of strong commitment between God and his messenger, if this bond is ignored, people will suffer for that as Yunus' people on the onset of distress did not know the way to dispose of it. Similar, with Yunus, he himself was detained for retribution.
e. Voice in these episodes varies, sometimes God addresses openly to the reader and sometimes Muhammad(SAW) articulates regarding what Allah says after having been directed to do so. This does imply that this message is the divine's word, not of Apostle to present something of his own.
f. As the basic theme of revelation is to convey the message of supreme God, various tools have been employed to win the goal, by quoting instances of the people of yore is one among them. Yunus' story also serves the purpose.

References

1. J. M. Rodwell, (Tr.), The Koran, Introduction, p. X, J.M. Dent and Sons Ltd, London, 1953
2. Arberry, A.J., The Koran Interpreted, Introduction, p. IX, Oxford University Press, London, 1982
3. Nicholson, Reynold, Literary History of Arabs, 2nd ed., p. 161, Kitab Bhawan, New Delhi, 1994
4. E.H. Palmer, The Koran, Introduction, p. XVII, Oxford University Press, London, 1949
5. George Sale, Koran, Commonly called al-Qur'an, The Preliminary Discourse, p. 48, Morrison and Gibb Ltd., Edinburgh,
6. Adams, Charles J., Qur'an, The Text and its History in Encyclopedia of Religions, 12/168, Macmilan Publishing Company, New York, 1987
7. Alfred Guillaum, Islam, 1st ed., p. 58, Penguine Books, 1954
8. Daniel Norman, Islam and the West, The Making of an Image, 3rd ed., p. 60, Edinburgh University Press, Edinburgh, 1966
9. Richard Bell, Introduction to the Qur'an, 3rd ed., p. 90, University Press Edinburgh, 1963
10. Al-Biqa'i, Burhan al-Din Abi al-Hasan Ibrahim ibn `Umer, Nazm al-Durar fi Tanasub al-'Ayat wa al-Suwar, al-Maktabah al-Nnajariyah, Makkah, 1992
11. Urdu Da'irah Ma`arif al-Islamiyah, 16/277, Danish Gah Punjab, Lahore, 1967
12. Al-Suyuti, Jalal al-Din, Muhammad Haleem Ansari(tr.), al-'Itqan, 2/268, Idarah Islamiyat, Lahore, 1982
13. Taqi `Usmani, `Uloom al-Qur'an, p. 267, Maktab Dar al-`Uloom, Karachi, 1998
14. Falahi, `Ubaid ullah Fahd, Qur'ani Karim mein Nazm-o-Munasat, p. 18, Dar al-Tadhkir, Lahore, 1999
15. Farahi, Hamid al-Din, Majmu`ah Tafasir-i-Farhi, p. 49, Faran Foundation, Lahore, 1991
16. Na`imi, Ahmed Yar Khan, Mufti, Tafsir Na`imi, Na`imi Kutub Khana, Lahore
17. Islahi, Amin Ahsan, Tadabbar-i-Qur'an, Muqadamah, p. 21, Faran Academy, Lahore, 1994
18. `Usmani, Muhammad Taqi, `Uloom al-Qur'an, p. 267, Maktabah Dar al-`Uloom, Karachi, 1988

19. Al-Rehman is mentioned three times in 21:26, 36 and 42; rehmatina in 21:75 and 86; Arehmanu al-Rahim in 21:83; and rehmatan is mentioned in 21:107
20. Tabrī, Muhammad ibn Jarīr, Tārīkh al-Umam wa'l-Mulūk, vol. 1, 457, Mu'ssasa al-'a`lamī LilMatbū`āt, Beirut, 1409A.H, Ibn-e-Kathīr, Ismā`īl ibn `Umer, al-Badā'iyah wa'l-Nihā'iyah, vol. 1, p. 321, Dār al-Fikr, Beirut, 1421A.H
21. Ibn-e-Kathīr, Ismā`īl ibn `Umer, Tafsīr Ibn-e-Kathīr, vol. 4, pp.21-22, Suhail Academy, Lahore, 1973
22. Al-Baghvī, Hussain ibn Mas`ūd, Ma`ālam al-Tanzīl, vol. 4, p. 43, Idārā Tālīfāt Ashrafiyah, Multan
23. Ibid, vol. 7, p. 530
24. Maududi, Abu'l 'a`lā, Syed, Tafhīm al-Qur'ān, vol. 3, pp. 183,184, Idara Tarjaman al-Qur'ān, Lahore, 1996,
25. Syed Qutab, Urdu tr. Syed Maroof Shah Sherazi, vol. 5, p. 629,Idara Manshurat Islami, Lahore, 1997
26. Abdullah Yusuf Ali, The Holy Qur'an, Text, Translation and Commentary, p. 1513, Sheikh Muhammad Ashraf Publishers and Book Sellers, Lahore, 2006
27. Al-Biqa'i, Burhan al-Din Abi al-Hasan Ibrahim ibn `Umer, Nazm al-Durar fi Tanasub al-'Ayat wa al-Suwar, al-Maktabah al-Nnajariyah, Makkah, 1992, vol. 9, p. 209
28. 'Aālūsī, shahāb-al-Dīn Syed Mahmood, Rūh-al-Ma`ānī fī Tafsīr al-Qur'ān al-`Azīm wa'l sab`al –Mathānī. Dār-al-fikr Li'l Ṭabā'ah wa'l Nnashr wa'lTauzī' Beirut 1424 AH vol.9 p.100.
29. Al-Tha`ālabī, abul Rehman, Jawāhir al-Hassān fī Tafsīr al-Qur'ān, Mu'assasah al-'a`lamī Lil-Matbū`āt, Beirut,
30. This theme has been given in this Surah, verse no. 1-20

*****